سفرنامہ

لنکا، سری لنکا

اے حمید

لنکا، سری لنکا

اے حمید

مدراس کا سفر

ہرن جنگل میں ہرنی کو اکیلا چھوڑ گیا
ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہرنی تھک گئی
ہرنی آم کے درخت تلے کھڑی ہے
کس طرف سے شکاری آیا؟
ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے

سری لنکا کا یہ درد بھرا لوک گیت میں نے اپنی آوارہ گردیوں کے زمانے میں ترچنا پلی کے ریلوے اسٹیشن پر سنا تھا۔ یہ گیت مجھے ایک سنہالی اسٹوڈنٹ نے سنایا تھا جو اس زمانے کے سیلون اور آج کے سری لنکا کا رہنے والا تا اور ترچنا پلی میں مندروں کی یاترا کرنے آیا تھا۔ میں نیچر پرست تھا اور نیچر کے حسین مناظر کی یاترا کرنے گھر سے نکلا تھا۔ ترچنا پلی کے مسافر خانے میں ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ دبلا پتلا سبزی مائل نسواری رنگ کا لڑکا تھا۔ یہ ۱۹۴۵ء کا سال تھا جہاں تک مجھے یاد ہے گرمیوں کا موسم تھا۔ بارشیں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اس سنہالی لڑکے کی شکل یاد رہ گئی ہے۔ اس کا نام بھول گیا ہوں۔ اس نے مجھے ہرنی کا سنہالی گیت اپنی زبان میں سنایا۔ پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا۔ اب میں نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اپنے ہرن کے بغیر ہرنی جنگل میں اکیلی ہے۔ ہرنی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس وقت یہ دردانگیز گیت سن کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ جس طرح کائنات کی بیکراں وسعتوں میں گردش کرتے دو سیارے پل بھر کے لیے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور پھر کبھی نہ ملنے کے لیے بچھڑ جاتے ہیں اسی طرح یہ سنہالی لڑکا بھی مدراس کے ایگمور ریلوے اسٹیشن تک میرے ساتھ سفر کرنے کے بعد مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا لیکن درد کی ماری ہرنی میرے پاس ہی چھوڑ گیا۔ مدراس میں کچھ روز آوارہ گردی کرنے کے بعد میں واپس اپنے شہر امرتسر آگیا۔ میرے دل میں لنکا جا کر اس ہرنی سے ملنے کی تمنا بیدار ہو چکی تھی۔ میں راتوں کو لنکا کے جزیرے کے خواب دیکھنے لگا۔ بودھ مندر کی سیاہ چشم پجاری لڑکیوں کو سانگری میں دیپ جلائے کنول کے پھول رکھے معبدوں کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھتا۔

پھر ایک رات ایسا ہوا کہ جنوبی سمندروں کی مرطوب ہوا کا جھونکا میرے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ میں چھت پر لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا۔ ہوا کے اس مرطوب جھونکے میں سری لنکا کے جزیرے میں چاندنی راتوں میں کھلنے والے ترناری کے سفید پھولوں کی گرم سحر انگیز خوشبو تھی۔ سمندری کھاڑیوں میں اگے ہوئے ناریل کے جھنڈوں کی پاکیزہ مہک تھی۔ یہ خوشبو ساحل کارومنڈل سے بھی دور سیلون کے گھنے جنگلوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے پاسنگ شو کا سگریٹ سلگایا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ اس زمانے کے سگریٹ بھی بڑے گرم جوش ہوا کرتے تھے۔ پاسنگ شو کے چوتھے کش پر مجھے گیان حاصل ہو گیا۔ میں نے جلتا ہوا سگریٹ دوسرے مکان کی چھت پر پھینکا اور ستاروں بھرے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔

''کولمبو چلو''

میں پانچویں جماعت یا شاید چھٹی جماعت پڑھتا تھا کہ مجھے یاد ہے اردو کی کتاب میں لنکا کی ایک تصویر دیکھی جس میں کیلے کے درختوں کے نیچے دو جھونپڑیاں بنی تھیں۔ جھونپڑیوں کے باہر عورتیں زرد کیلوں کے گچھے اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان عورتوں نے قمیض کے اوپر کمر تک دھوتی باندھ رکھی تھی۔ کیلے کے درختوں کے نیچے گہری سبز چھاؤں تھی۔ یہ تصویر میرے دل میں بیٹھ گئی اور اسی وقت میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ بڑے ہو کر اس لنکا دیش کی سیر ضرور کروں گا۔ جہاں کیلے کے درختوں کے جھنڈ ہوتے ہیں اور عورتیں زرد کیلے کے گچھے لیے جھونپڑیوں کے باہر کھڑی رہتی ہیں۔ میٹرک کا امتحان دیا تو نتیجے کا انتظار کئے بغیر ایک روز گھر سے بھاگ کر مدراس کی طرف چل پڑا۔ کیلوں کے جھنڈ' ناریلوں کے جنگل اور جنوب مشرقی ایشیا کی لگاتار ہونے والی بارشیں تھیں جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ پھر ترچناپلی کے ریلوے اسٹیشن پر لنکا کے اسٹوڈنٹ نے سنہالی گیت سنایا تو بچپن میں دیکھی ہوئی سری لنکا کی تصویر کے نقوش ابھر آئے۔ اس سفر میں کسی وجہ سے مدراس سے آگے نہ جا سکا۔ واپس امرتسر آ گیا لیکن پھر جب ایک رات جنوبی سمندروں کی ہوا کا مرطوب جھونکا میری اردگرد ترناری اور کنول پھولوں کی پاکیزہ نیم گرم مہک بکھیر کر نکل گیا تو میں نے کولمبو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کولمبو چلو' کولمبو چلو۔۔۔۔۔۔۔۔ کیلے کے جھنڈوں میں بنی ہوئی بانس کی جھونپڑیوں کے باہر کھڑی سانولی سنہالی لڑکیاں اپنے سیاہ بالوں میں گل مہر کے سرخ پھول لگائے مجھے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔

میں جب بھی کسی سفر پر نکلتا تو گھر سے بھاگ کر ہی نکلتا تھا۔ تن کے کپڑوں اور چند روپوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ جہاں رات پڑتی سو جاتا۔ جہاں دن نکلتا چل پڑتا۔ ان آوارہ گردیوں کی ایک وجہ میری ناریل کے جنگلوں میں ہوتی بارش' جھیلوں میں کھلے کنول کے پھولوں اور قدیم مندروں کی افسانوی دیوالیوں سے محبت بھی تھی اور دوسری مگر سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اباجی مجھے پہلوان

بنانا چاہتے تھے۔امرتسر کے کشمیری گھرانوں میں جس لڑکے کا ہڈ کاٹھ اچھا ہوا سے پہلوان بنا دیا جاتا تھا۔میرے بھائیوں میں سے قرعہ میرے نام نکل آیا اور والد صاحب نے پہلی بسم اللہ یہ کی کہ میری ٹنڈ کرا دی میں اپنے اسکول کے دوستوں سے اپنی ٹنڈ چھپاتا پھرتا تھا۔بڑی شرمندگی ہوتی۔والد صاحب خود بھی پہلوانی کرتے تھے۔وہ مجھے امرتسر کا نامی گرامی پہلوان بنانا چاہتے تھے۔منہ اندھیرے مجھے اٹھا کر تحصیل پورے والی ریلوے لائن پار کر کے شیخ چلی کے اکھاڑے میں لے جاتے۔یہ اکھاڑا امرود کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔میں ساتویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔مجھے آج بھی یاد ہے کہ ان درختوں میں سے کچے امرودوں کی تازہ مہک آیا کرتی تھی۔قریب ہی ایک چھوٹی نہر بہتی تھی۔اس نہر کی طرف سے ٹھنڈے پانی میں ڈوبے ہوئے کنارے کے گھاس کی مرطوب خوشبو کا جھونکا بھی آجاتا تھا۔یہ خوشبوئیں میرے دل میں ایک نامعلوم سا درد پیدا کر کے مجھے سوگوار کر دیتیں۔بچپن کی یہ پاکیزہ نزل خوشبوئیں آج بھی میرے دل کے معبد میں اس طرح تر و تازہ ہیں اور میرے ماضی' میرے حال اور میرے مستقبل اور میری موت کے بعد کی زندگی کا بے حد قیمتی سرمایہ ہے۔مجھے یقین ہے کہ جب میں مرنے لگوں گا تو یہ خوشبوئیں نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اپسراؤں میں شکل میں مجھے لینے آئیں گی۔وہ گھڑی کتنی خوبصورت ہو گی۔

بہر حال میں لنکا کی طرف بھاگنے کا پروگرام بنا چکا تھا اور کرایہ اکٹھا کرنے کی فکر میں تھا۔والد صاحب منہ اندھیرے مجھے اٹھاتے اور اکھاڑہ شیخ چلی کا رخ کرتے۔میں اپنے بدن پر تیل ملتا۔کچھ دوسرے پہلوان بھی وہاں پہلے سے موجود ہوتے۔پچھلے پہر کے نیلگوں اندھیرے میں وہ اکھاڑے میں زور کرتے مجھے بھوت پریت لگتے۔والد صاحب مجھے بھی اکھاڑے میں کھینچ لیتے اور ایسی دھولیں مارتے کہ سری لنکا کا سارا جزیرہ ہل جاتا۔وہ مجھے اس زمانے کے مشہور سکھ پہلوان کیکر سنگھ کے بیٹے سے لڑانا چاہتے تھے۔ باداموں کی سردائی پلاتے ہوئے وہ کہتے۔

''پی جا پترا' کیکر سنگھ دے پتھے نوں ڈھاونا ای۔''

امرتسر میں ہمارے محلے کے باہر رام ملائی کی سرائے میں دنگل ہوا کرتے تھے'ابا جی مجھے خاص طور پر وہاں کشتیاں دکھانے لے جاتے۔جب کوئی پہلوان اپنے حریفوں کو چاروں شانے چت گراتا تو مجھے جھنجھوڑ کر کہتے۔

''اس نے کلا جنگ لگائی تھی پتر'اس داؤ کو یاد رکھنا۔''

وہاں ایک تالاب ہوا کرتا تھا۔جو آدھا بڑ کے درخت نے ڈھانپ رکھا تھا۔والد صاحب یہاں نہانے آتے۔تیرنا انہوں نے مجھے یوں سکھایا کہ مجھے یاد ہے میں بہت چھوٹا سا تھا کہ مجھے تالاب میں پھینک دیا اور ساتھ ہی خود بھی چھلانگ لگا دی اور پانی میں مجھے

نیچے سے ہتھیلی پر اٹھا کر کہا۔

''مینڈک تاری لگاؤ''

میں جنوب مشرقی ایشیا کی موسلا دھار بارشوں اور ناریل اور کیلے کے جھنڈوں کی یاد میں اداس رہتا کہ آخر ایک روز امرتسر سے فرار ہونے کا حتمی منصوبہ تیار کر لیا۔ رخت سفر باندھنے کی حاجت نہیں تھی کیونکہ میرے پاس کوئی رخت نہیں تھا۔ بس کولمبو تک کا کرایہ چاہیے تھا۔ اگر وہ بھی نہیں تو میں ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ ایک بار بمبئی سے دلی تک بغیر ٹکٹ کے آیا تھا۔ برہان پور پر پکڑا بھی گیا۔ نوعمری کے باعث ٹکٹ بابو نے مجھے برہان پور کے پلیٹ فارم پر ہی فرنٹیر میل سے اتار دیا گیا مگر میں دوسری ٹرین پکڑ کر چل دیا۔ لیکن اس بار بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی نوبت نہ آئی اور اپنی تین بڑی بہنوں سے کچھ روپے الگ الگ کہانیاں سنا کر ہتھیائے اور امرتسر ریلوے اسٹیشن کی طرف کھسک گیا۔ سن ۱۹۴۵ء میں دو سو روپے بہت ہوتے تھے۔ جو میری جیب میں تھے۔ ایک ٹوتھ برش بھی تھا۔ کمر کے گرد بوسکی کا ایک کرتہ پاجامہ لپیٹ رکھا تھا۔ سگریٹ خیر سے نوعمری میں ہی شروع کر دیتے تھے۔ جیب میں پاسنگ شو کا پیکٹ بھی تھا۔ فرنٹیر میل ان دنوں رات کو امرتسر سے چلا کرتی تھی۔ یہ گاڑی پشاور سے سیدھی بمبئی جاتی تھی۔ امرتسر سے بمبئی کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور لوگوں کی نظریں بچا کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔ فرنٹیر میل میں سو میل سے کم فاصلے کا ٹکٹ نہیں ملتا تھا۔ مجھے ایک ہی خوف تھا کہ اگر کسی محلے والے نے دیکھ لیا تو وہ مجھے کان سے پکڑ کر والد صاحب کے پاس پہنچا دے گا۔ انہوں نے میرے پیچھے جاسوس چھوڑ رکھے تھے کیونکہ میں ہر دوسرے تیسرے مہینے گھر سے فرار ہو کر کبھی دلی' کبھی کلکتہ اور کبھی بمبئی پہنچ جاتا تھا۔ جب تک فرنٹیر میل امرتسر کے مکانات سے باہر نہیں نکل گئی۔ میں ڈبے کے ٹائیلٹ میں چھپا رہا۔ جب شریف پورے کی روشنیاں بہت پیچھے رہ گئیں تو ٹائیلٹ سے نکل آیا۔ فرنٹیر میل بڑی تیز رفتار گاڑی تھی۔ امرتسر سے نکلتے ہی اس نے جو سپیڈ پکڑی تو جالندھر پہنچ کر دم لیا۔ یہاں تھوڑی دیر رکی اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

ٹرین دہلی پہنچی تو میں نے سب سے پہلے پلیٹ فارم کے ٹی سٹال پر ناشتہ کیا۔ گرمیوں کا موسم تھا مگر ابھی مون سون شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میں سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم کی طرف بڑھا تو اندر ایک پھولی ہوئی مونچھوں والا انگریز آرام کرسی پر ٹانگیں پسارے نیم دراز تھا۔ میں وہیں سے واپس مڑا اور انٹر کلاس کے ویٹنگ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ کمر کے گرد جو بوسکی کا کرتہ پاجامہ لپیٹ رکھا تھا اسے کھول کر پہنا۔ پرانے کپڑے وہیں ایک طرف پھینک دیئے۔ چھوٹی کنگھی سے بال بنائے اور باہر پلیٹ فارم پر آ کر ایک قلی سے پوچھا کہ مدراس کو گاڑی کب اور کون سے پلیٹ فارم سے روانہ ہوتی ہے۔ اس نے بتایا کہ مدراس ایکسپریس دوپہر کے بعد پلیٹ

فارم نمبر سات سے چھوٹے گی۔ باہر جا کر مدراس تک کا تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا۔ اب میں بھول گیا ہوں کہ کتنے روپے لگے تھے۔ سوچا ابھی ٹرین میں کافی وقت ہے کیوں نہ دلی کی سیر کر لی جائے۔ دلی میں کئی بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ ٹرام میں بیٹھ کر جامع مسجد پہنچ گیا۔ کچھ دیر لال قلعے کی سیر کی۔ پھر جامع مسجد کے قریب ہی ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ چائے پی۔ سگریٹ سے لطف اندوز ہوا اور ایک بجے کے قریب واپس ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ مدراس ایکسپریس پلیٹ فارم نمبر سات پر تیار کھڑی تھی۔ آج کل اس گاڑی کا نام تامل ناڈو ایکسپریس ہے۔

رش بہت تھا۔ اگرچہ میرے پاس سکون کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی گاڑی میں داخل ہونے کی جگہ نہ تھی۔ ایک قلی کو دو روپے دیئے تو اس نے سیکنڈ کلاس کے ساتھ لگے نوکروں کے ڈبے میں مجھے دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹرین چل پڑی۔ یہ بنگلی اور مدراسی بیرے تھے اور اپنے صاحب لوگوں کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ ان میں ایک فرخ آباد کا ڈھیر عمر کا بیرا بھی تھا۔ اس نے کمال مہربانی سے مجھے ٹائیلٹ کی دیوار کے ساتھ فرش پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ مجھ سے پوچھا کہاں جاؤ گے برخوردار؟ میں نے مدارس کا نام لیا تو باقی بیرے بھی چونکے۔ کچھ اس لیے کہ یہ مصیبت مدراس تک ہم سے چمٹی رہے گی اور کچھ اس لیے کہ میرے پاس سامان کچھ نہیں تھا۔ فرخ آبادی بیرے نے تعجب سے پوچھا کہ میرا سامان کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ میں بغیر سامان کے سفر کیا کرتا ہوں۔ وہ ہنسنے لگے۔ مدراس ایکسپریس نئی دلی کے اسٹیشن پر رک گئی۔ یہاں سے چلی تو حضرت نظام الدین کے اسٹیشن پر چند لمحے ٹھہری۔ پھر فرید آباد کو پیچھے چھوڑ دیا اور دھڑ دھڑاتی' شور مچاتی دھواں اڑاتی ایک سو پینتالیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد متھرا جا کر رکی۔ متھرا سے چلی تو آگرہ کینٹ جا کر ٹھہری۔ اس کے بعد نہ جانے کتنے اسٹیشنوں کو پیچھے چھوڑتی آخر گوالیار جا کر دم لیا۔ گوالیار سے جھانسی قریباً ایک سو میل کے فاصلے پر ہے۔ گوالیار میں ہی رات ہو گئی تھی۔ جھانسی پہنچ کر رات کا کھانا کھایا۔ پھر سو گیا۔

مدراس ایکسپریس رات کی تاریکی میں ہی جنگلوں' بیابانوں اور دریاؤں کو پار کرتی آگے بڑھتی چلی گئی۔ جھانسی سے بینا اور پھر بھوپال آ گیا۔ یہاں دن نکل آیا تھا بھوپال سے چلی تو ہوشنگ آباد جا کر دم لیا۔ اب جو مدراس ایکسپریس چلی تو اٹارسی اور بیتول سے نکل کر چلتی ہی چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ اب ناگ پور آئے گا۔ دریا گزرے پہاڑ گزرے' جنگل گزرے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے اسٹیشن گزرے' مگر ناگ پور نہ آیا۔ آخر خدا خدا کر کے اگلے روز دن کے وقت ٹرین ناگ پور کے بہت وسیع ریلوے یارڈ میں چھک چھک کرتی داخل ہوئی۔ ناگ پور کے پلیٹ فارم پر میں نے ایک سنگترہ خریدا۔ باہر سے ہرا کچور مگر چھیلا تو اندر سے کیسری۔ کبھی ان سنگتروں کی بڑی تمنا کیا کرتے تھے لیکن پاکستان کے کینوؤں نے دھوم مچا دی ہے اور اب بھارت کے لوگ کینوؤں کی تمنا کرتے ہیں۔

پاکستان کے کیونے ناگ پوری سنگترے کو مات کر دیا ہے اور اس کا اعتراف بھارت سے آنے والے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ناگ پور سے ٹرین چلی تو واردھا رکی۔ پھر چندرا پور بل ہرشا نگر رامانگندم قاضی اور سکندر آباد سے ہوتی ہوئی حیدر آباد پہنچ گئی۔ حیدر آباد کے پلیٹ فارم کو دیکھ کر ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی تھی کہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے خوشحال مسلم ریاست کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ ترکی ٹوپیاں' گلے تک بند شیروانیاں' عطر' قوام اور کبابوں کی خوشبوئیں اور چار مینار کے سگریٹ۔ میں نے چار مینار سگریٹ کا ایک پیکٹ لیا۔ بڑا تیز سگریٹ تھا اور اب بھی ہے۔ آگے پھر قاضی پت کا اسٹیشن آ گیا۔ پھر ورنگل اور ورنگل کے بعد وجے واڑھا یا بیجواڑہ کا اسٹیشن آیا۔ میں پلیٹ فارم پر اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ دراصل مجھے کسی حجام کی تلاش تھی۔ کیونکہ خدا جانے کب سے ٹرین میں بیٹھا تھا۔ شیو بڑھ آئی تھی۔ میں نے ایک کالے لنگوٹے آدمی کو دیکھا کہ پلیٹ فارم کی حدوں سے باہر تاروں کے پاس کھڑا استرا ہاتھوں میں لے لہرا رہا تھا۔

آپ اسے مبالغہ مت سمجھئے گا۔ میں سفرنامہ لکھ رہا ہوں کوئی افسانہ نہیں لکھ رہا۔ اس آدمی کی شکل آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں قریب گیا تو ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بولا کہ شیو کر دوں؟ میں نے کہا' تم پلیٹ فارم پر کیوں نہیں آتے؟ وہ بولا کہ چلتے پھرتے حجاموں کو پلیٹ فارم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے تاروں پر ایک ٹانگ رکھ دی اور وہ میری داڑھی پر صابن لگانے لگا۔ وہ تاروں کی دوسری طرف کھڑا تھا اور میں اس طرف۔ پھر اس نے میری شیو بنانی شروع کر دی۔ آپ یقین کریں کہ ابھی اس نے میری آدھی شیو بنائی تھی کہ ٹرین کے انجن نے سیٹی بجا دی۔ فلموں میں ایسا ہوتے اکثر دیکھا ہے لیکن یہ حقیقت میں میرے ساتھ ہوا کہ میں آدھی شیو کے ساتھ ٹرین کی طرف اٹھ دوڑا۔ بیجواڑہ سے انگول نیلور اور پھر گڈ پور سے ہوتے ہوئے آخر خدا خدا کر کے ٹرین مدراس سنٹرل کے وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ نوجوانی کا زمانہ تھا' جسم میں بھرپور طاقت تھی' پھر بھی اس لمبے سفر نے تھکا دیا تھا۔

کیسری آنکھوں والی

ٹرین مدراس کے اسٹیشن ایگمور پر کھڑی تھی۔

ٹرین کے رکتے ہی کالے کالے مدراسی قلیوں نے ٹرین پر یلغار بول دی۔ ہمارے ٹکٹ مدراس سے ایک اسٹیشن پیچھے ٹرین میں ہی ٹکٹ چیکر نے چیک کر لیے تھے۔ ٹرین جہاں کھڑی تھی اس کے ساتھ ہی شہر کی ایک کشادہ سڑک تھی جہاں ٹیکسیاں' بیل گاڑیاں' ہاتھ رکشا اور دوسری کاریں کھڑی تھیں۔ ہوٹلوں کے ایجنٹ مسافروں کو گھیر کر اپنے اپنے کارڈ دکھاتے ہوئے چرب زبانی میں ایک

دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ انگریزی' ہندوستانی اور تامل بول رہے تھے۔ میں نے ایک ہتھ رکشا والے سے پوچھا کہ یہاں کوئی سرائے بھی ہے کیا؟ ہاتھ سے رکشا کھینچنے والے نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ہاں بابو' آشی رف کا سرائے ادھر ہے۔'' میں نے کہا کہ مجھے وہاں لے چلو۔ اس نے جو نام بولا تھا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چونکہ اس نے سرائے کا نام بھی لیا تھا اس لیے چل پڑا کہ نام کچھ بھی ہو کم از کم سرائے تو ہوگی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سرائے کا نام اشرف سرائے تھا۔ اس زمانے میں شہروں میں انتارش نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی مدراس ہندوستان کا ایک بڑا شہر تھا۔ اونچی اونچی پختہ عمارتیں' کشادہ سڑکیں' ناریل اور پام کے درخت' کوٹھیوں کے احاطوں میں کیلوں کے جھنڈ' سڑکوں پر دوڑتی کاریں' بیل گاڑیاں اور رکشا ئیں جنہیں دبلے پتلے قرنگی چلاتے تھے۔ سرخ اور سبز ساڑھیوں میں ملبوس دبلی پتلی گہری سانولی مدراسی لڑکیاں' کسی کسی کے جوڑے میں رجنی گندھا کے پھول بھی لگے تھے۔ ہوٹلوں میں سے آتی لوبان کی گہری مہک اور دھوتیوں' سفید پتلونوں اور پاجاموں میں ملبوس سوکھے سوکھے سے لوگ۔ رکشا والے قرنگی نے اشرف سرائے کے بوسیدہ دروازے کے سامنے جا کر رکشا روک لیا۔ بے چارہ قرنگی ہانپ رہا تھا۔ اشرف سرائے ایک پرانی دومنزلہ عمارت تھی اس کے دفتر میں میز کرسی کے علاوہ ایک کھاٹ بھی بچھی تھی جس پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب سرائے کے چیف ایجنٹ ہیں اور یہی مسافروں کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کا نام کبیر دین تھا اور بہار کے رہنے والے تھے مگر مدراس میں رہتے ایک عمر بیت گئی تھی۔ انہوں نے حقہ پیتے ہوئے نگاہ غلط انداز سے مجھے دیکھے اور صرف دو باتیں کیں۔

''یہاں پانچ روپے رکھ دو۔''

اور نوکر کو آواز دے کر کہا۔ ''لڑکے! اسے اوپر جالی میں لے جاؤ۔''

اوپر والی جالی ایک تنگ کمرہ تھا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ بازار کی طرف جو کھڑکی کھلتی تھی اس کے سارے شیشے غائب تھے۔ نوکر نے دو روپے بستر کے' ایک روپیہ چارپائی' ایک روپیہ پانی کا اور دو روپے بجلی کے وہیں مجھ سے لے لیے اور یہ ساری سہولتیں مجھے حاصل ہو گئیں۔ میں نے اپنے کپڑے دھوئے' غسل کیا' کپڑے سکھا کر پہنے ہوئے پہنے اور نیچے ایک ریستوران میں آ کر کھانا کھایا۔ بڑی مشکل سے یہ کھانا کھایا۔ پتھر کی میز پر مدراسی بیرے نے کیلے کا پتا بچھا دیا۔ پھر چاولوں کی کیتلی لے کر آیا۔ کیلے کے پتے پر کیتلی میں سے تھوڑے سے چاول نکال کر ڈالے۔ پھر دوسری کیتلی میں سے بینگن کی بھجیا نکال کر رکھی اور پلیٹ میں سرخ مرچیں گھول کر لے آیا۔ چاولوں اور بھجیا میں اتنی مرچیں تھیں کہ میں ایک ہزار برس تک سرخ مرچ کا نام بھی زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔

لنکا کر بھی ان دنوں برطانیہ کی حکومت تھی۔ معلوم ہوا کہ کولمبو تک کا ٹکٹ مدراس سے ہی مل جائے گا مگر ایک پرمٹ اور میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا پڑے گا۔ اشرف سرائے کے مختار یا کار پرداز کبیر دین صاحب حقے کا کش لگاتے ہوئے بولے۔

''میاں برخوردار لنکا جا رہے ہو۔ ٹیکہ لگے گا۔ پرمٹ بنے گا۔ چھ سات روز لگ جائیں گے۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ ایک ڈاکٹر سے میری واقفیت ہے۔ سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

دوسرے روز کبیر دین صاحب مجھے فورٹ کے علاقے میں لے گیا۔ ایگمور کے ریلوے اسٹیشن سے ہم نے لوکل ٹرین پکڑی اور فورٹ پہنچ گئے۔ کبیر دین مجھے مختلف بازاروں میں گھماتا ہوا ایک پرانی بلڈنگ میں لے آیا جہاں گلی میں مدراسی عورتیں چٹائیوں پر بیٹھی بیڑیوں کے پتے چھانٹ رہی تھیں۔ اس بلڈنگ کے ایک کمرے میں کبیر دین کے واقف کار ڈاکٹر کا مطب تھا۔ لمبے دانتوں اور سوکھے چہرے والا یہ مدراسی سیاہ فام ڈاکٹر مجھے گھور کر دیکھنے لگا۔ کبیر دین نے اسے تامل زبان میں کچھ کہا۔ ڈاکٹر مسکرایا' اس کے دانت مزید لمبے ہو گئے۔ ہندوستانی میں بولا۔

''ابھی ٹیکہ لگے گا۔''

میرے بازو پر ٹیکہ لگانے کے بعد بولا۔

''دو روز بعد دوسرے باجو پر بھی لگے گا۔''

ٹیکے کی فیس پانچ روپے دلوائی گئی۔ اس روز میرا بازو درد کرتا رہا۔ دوسرے دن بھی ٹیکے والی جگہ پر سوجن تھی۔ میں سرائے میں پڑا پڑا تنگ آ گیا تھا۔ چنانچہ میں مدراس کی سڑکوں پر نکل آیا۔ اشرف سرائے کی نشانی ذہن میں رکھ لی اور سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ میں نے تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ جتنا تھرل کسی اجنبی شہر کی اجنبی اور ان دیکھی سڑکوں پر گھومنے پھرنے میں ہے اتنا مزہ اور ایڈونچر ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے میں بھی نہیں۔ ہر چہرہ نیا ہے۔ اسے پہلے نہیں دیکھا۔ کوئی آپ کو نہیں جانتا۔ آپ کسی کو نہیں جانتے۔ ہر سڑک کا موڑ ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے جسے آپ نے پہلے نہیں دیکھا۔ ایسی شکل سامنے آ رہی ہیں جنہیں آپ ایک بار دیکھنے کے بعد شاید زندگی بھر نہ دیکھ سکیں۔ سب عورتوں اور مردوں کے رنگ گہرے سانولے اور کالے تھے۔ تامل اور تیلگو زبان میں بات کرتے جس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عورتوں کی آنکھیں شربتی رنگ کی تھیں اور ہونٹ براؤن کلر کے تھے۔ اکثر عورتوں کی آنکھیں شربتی رنگ کی تھیں اور ہونٹ براؤن کلر کے تھے۔ اکثر عورتوں نے درمیان میں سے مانگ نکال رکھی تھی اور پیچھے جوڑا بنا کر اس میں رجنی گندھا کے پھول سجا رکھے تھے۔ چائے کی دکانوں سے تامل گانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بڑی بڑی عمارتوں کی طرز تعمیر

قدیم انگریزی وضع کی تھی۔ بازاروں میں گرمی اور حبس بہت تھا۔ مون سون شروع ہونے والی تھی۔ بعض سڑکیں ایسی تھیں کہ جن کے کنارے ناریل کے درخت اگے تھے۔ دکانوں اور ریستورانوں کے باہر تامل تلیگو اور کہیں کہیں انگریزی زبان میں بھی بورڈ لگے تھے۔ انگریزی اور ہندوستانی یہاں کی لنگوفرانیکا تھی۔ آپ مدراس میں قلی سے بھی انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔ آٹھویں اور نویں جماعت کی لڑکیاں لڑکے بڑی روانی سے انگریزی زبان بول لیتے ہیں۔ لمبے دانتوں والے مدراسی ڈاکٹر نے میرے دوسرے "باجو" پر بھی ٹیکہ لگا دیا۔ کبیر دین نے مجھ سے بیس روپے لے کر ڈاکٹر کو دلوائے اور بولا۔

"پچاس کا کام تھا میاں جو بیس پچیس میں ہو گیا۔ اب تمہیں پرمٹ بنوائے دیتا ہوں۔"

پرمٹ کے پندرہ روپے لگے۔ جب سارے کاغذات مکمل ہو گئے تو میں نے ٹیکسی پکڑی اور مدراس کے دوسرے بڑے ریلوے اسٹیشن کلیان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹرین کا میں نے پہلے ہی سے پتہ کر لیا تھا۔ ابھی ٹرین چھوٹنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا کہ میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ بکنگ ونڈو سے کولمبو تک کا ٹکٹ خریدا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ کتنے روپے دینے پڑے تھے۔ اتنا یاد ہے کہ تیس یا پینتیس روپے سے زیادہ کرایہ نہیں تھا۔ سفر بڑا لمبا تھا۔ مدراس سے ایک رات اور ایک دن کا سفر ہندوستان کی نچلی تکون کے اسٹیشن دھنش کوڈی تک کا تھا۔ اس کے آگے آدھ گھنٹے کا سمندری سفر اور پھر کالی مینار سے ایک رات اور ایک دن کا سفر کولمبو تک۔ مدراس کا اسٹیشن کلیان بہت بڑا ریلوے اسٹیشن ہے۔ دھنش کوڈی تک جانے والی ایکسپریس ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ یہاں بھی خوب رش تھا۔ ایک ڈبے میں کچھ سرمنڈی بودھ بھکشنیں گیروے لباس میں بیٹھی تھیں۔ میں بھی اسی ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ کالے کلوٹے مدراسی لوگ تامل زبان میں شور مچا کر باتیں کر رہے تھے۔ کوئی بیڑی پی رہا تھا۔ کوئی چٹا یعنی سگار پی رہا تھا۔ عورتیں بھی سگار پی رہی تھیں۔ پلیٹ فارم پر میں نے کافی پی۔ یہاں چائے بہت کم پی جاتی ہے۔ لوگ کافی کے عاشق ہیں۔ تاڑی بھی بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ تاڑی کی دکانوں پر لکڑی کے بٹھل ہلکے سفید رنگ کی تاڑی سے بھرے ہوتے ہیں۔ یہاں عورتیں بھی زمین پر بیٹھ کر مٹی کے آبخوروں یا ناریل کے پیالوں میں تاڑی پیتی ہیں اور پھر آپس میں خوب لڑتی ہیں۔ مجھے وہ مدراسی عورت آج بھی یاد ہے جسے میں نے تاڑی کی ایک دکان کے باہر سیڑھیوں پر دھت پڑے دیکھا تھا۔

ٹرین کے ڈبے میں کافی حبس تھا۔ بودھ بھکشنیں خاموش بت بنی بیٹھی تھیں۔ مدراسی پھنگی اور قرنگی اپنے تیل بھرے سیاہ بالوں کو کھینچ کر پیچھے ایک چھوٹی سی چٹیا بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ پان چبا رہے تھے۔ بیڑیاں سگار پی رہے تھے اور کھڑ کھڑ باتیں کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے پلیٹ فارم پر گارڈ کی سیٹی کی آواز گونجی۔ اس کے بعد انجن نے وسل دیا۔ اور پھر ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ ٹرین

پلیٹ فارم سے باہر نکلی تو کچھ تازہ ہوا آئی اور سکون ملا۔ بودھ عورتیں ابھی تک خاموش بیٹھی تھیں۔ ٹرین مدراس کے مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ کشادہ ریلوے یارڈ کی ایک جانب کارخانوں کی چمنیاں نظر آنے لگیں۔ دوسری طرف ناریل اور تاڑ کے درختوں کے درمیان ڈھلانی چھتوں والی کوٹھیاں اور بلند عمارتیں اور پانی کی ٹینکیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک پل پر سے موٹر کاریں اور ٹرک گزر رہے تھے۔ ٹرین کی رفتار دھیمی تھی۔ کشادہ ریلوے یارڈ میں ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا تھا۔ ٹرین بل کھاتی اپنی خاص پٹڑی پر راستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔ مدراس کا ہندوستان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ ریلوے یارڈ میں سے ٹرین گزرتے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اب ریلوے لائن بالکل سیدھی ہو گئی تھی۔ دونوں جانب کوٹھیوں اور بنگلوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ کیلے' آم اور پپیتے کے باغ آنے لگے۔ پھر دھان کے کھیت شروع ہو گئے۔ ٹرین کئی پلوں کے نیچے سے اور ریلوے پھاٹکوں کے بیچ میں سے گزرنے کے بعد کھلے کھیتوں اور ناریل تاڑ کے درختوں سے بھرے ہوئے میدانوں میں آ گئی۔ ٹرین تالابوں کے قریب سے گزرتی تو میں کھڑکی میں سے ان کنول کے پھولوں کو دیکھتا جو تالابوں میں کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی میں سے جو ٹھنڈی ہوا آتی اس میں ناریل دھان اور کیلے کے پتوں کی مرطوب خوشبو رچی تھی۔

اب مجھے کچھ پرواہ نہیں تھی کہ ٹرین میں بیٹھے پھنگی اور فرنگی تامل اور تلیگو زبانوں میں کیا شور مچا رہے ہیں میرے لیے ٹرین سے باہر حد نگاہ تک دھان کے کھیت' کیلے کے باغ اور ناریلوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ میں ان میں آ کر بہت خوش تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر مسرت سے اپنی ٹہنیاں ہلاتے اور مجھے الوداع کہتے۔ کہیں کیچڑ سے بھرے کھیتوں میں ہلچل رہے تھے۔ کہیں عورتیں اور مرد دھان کی پنیری بو رہے تھے۔ ٹرین ایک دریا کے پل پر سے دھڑ دھڑاتی گزر گئی۔ گاؤں کے مکان ناریل کے چھپر ڈال کر بنائے گئے تھے جن کے باہر کبھی کوئی عورت ناریل کی چھال سکھاتی نظر آتی تو کہیں مرد کھیتوں میں کام کر رہے ہوتے۔ ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ کوئی شہر آتا تو پل بھر کو رکتی اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتی۔ شام ہونے تک میرے ڈبے کے کئی مسافر بدل گئے تھے۔ مگر ان سب کی وضع قطع اور بول چال ایک جیسی ہی تھی۔ بات کرتے تو لگتا کہ ڈھلان پر پتھر لڑھک رہے ہیں۔ سب پان بیڑی کے رسیا تھے۔ سب کے رنگ کالے تھے اور آنکھیں سپیروں کی آنکھوں ایسی کیسری رنگ کی تھیں۔ شام ہو رہی تھی کہ ٹرین شاید مجورا کے ریلوے اسٹیشن پر رکی تو سفید دھوتی پالش مدراسی گائیڈ ہر ڈبے کی کھڑکی میں سر ڈال کر انگریزی میں کہتے۔

''رامیشورم کے مندروں کی یاترا کرنے والے ہمارے ساتھ آ جائیں۔''

یہاں کئی یاتری اتر گئے۔ رات بھر ٹرین اپنے سفر پر رواں دواں رہی۔ بودھ بھکشو عورتیں کسی اسٹیشن پر اتر گئی تھیں۔ اگلے روز

صبح ہوئی تو ترچنا پلی کا مشہور شہر آ گیا۔ یہاں ٹرین تقریباً آدھا گھنٹہ رکی رہی۔ بہت بارونق اسٹیشن تھا۔ کتنے ہی پلیٹ فارم تھے جن کے اوپر پل بنے ہوئے تھے۔ یہاں عورتوں نے بڑے سلیقے سے ساڑھیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ ان کے بالوں میں سفید پھولوں کے گجرے لگے تھے اور اکثر لڑکیوں کے ناک میں سرخ نگینے چمک رہے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر سگریٹ سلگائے ٹہل رہا تھا۔ ترچنا پلی کے سگار اور ساڑھیاں بہت مشہور ہیں۔ یہاں کا سلک اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میں نے کتھئی رنگ کی ساڑھی والی ایک تامل لڑکی کو دیکھا کہ بالوں میں پھول سجائے چلی آ رہی ہے۔ میرے قریب سے گزری تو مجھے ناریل اور اگر بتی کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں لوہے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی پلیٹ فارم پر بنے ہوئے پل کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر لڑکی نے نہ جانے کس خیال کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں مجھے ایک تجسس سا محسوس ہوا۔ جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو جیسے دل میں کہہ رہی ہو کہ اس شکل کو میں نے پہلے کہاں دیکھا تھا؟ کیا کسی پچھلے جنم میں دیکھا تھا؟ وہ پل پر سے گزرنے لگی۔ پل کے آگے جا کر سیڑھی اترتے وقت اس نے ایک بار پھر گردن گھما کر مجھے دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتی تیسرے پلیٹ فارم کے مسافروں میں گم ہو گئی۔ اسی لمحے میرے دل نے آواز دی۔ ناریل اور کنول کے پھولوں کے دیس کی اس خوشبودار دیوداسی کے پیچھے نکل چل۔ بھاڑ میں جائے کولمبو امرتسر اور روشن مستقبل ۔۔۔۔۔۔۔ چل اس دیوداسی کے ساتھ ہو جا۔ جہاں وہ جاتی ہے تو بھی وہیں چلا چل۔ رجنی گندھا کے مہکتے گجروں' تالاب میں کھلے کنول پھولوں اور برسات کی ہواؤں میں جھومتے ناریلوں اور دو سیاہ آنکھوں کے سوا اس دنیا میں رکھا کیا ہے؟ سو سال بھی زندہ رہا تو سوائے موت کے کچھ نہیں ملے گا۔ ترچنا پلی کی اس دیوداسی کی سیاہ آنکھیں تجھے اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ ان کنول ایسی آنکھوں میں گم ہو جا۔ کاروان حسن کے خوشبو اڑاتے غبار میں اتر کر امر ہو جا۔ کروڑوں اربوں سالوں کی گردش کے بعد دو ستارے ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔ اب کے بچھڑے تو پھر شاید کبھی خوابوں میں بھی ملاقات نہ ہو۔ ٹرین جہاں جاتی ہے جانے دو۔ تو روپ نگری کی اس حسین نرتکی کے حضور محبت کا نذرانہ پیش کر۔ میرا دل مجھے آوازیں دیتا رہا۔ مجھے بار بار پکارتا رہا اور حسین دیوداسی' روپ نگری کی نرتکی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کروڑوں برسوں کے بعد ایک سیارہ میرے قریب آیا اور پھر گزر گیا۔ میں نے دل کی بات نہ مانی اور اپنی ناپائیدار مصلحتوں اور احمقانہ مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑا ستون کے ساتھ لگا سگریٹ پیتا رہا۔ خوشبوؤں میں لپٹی روشنی کی کرن میری آنکھوں کو چکا چوند کرتی آگے نکل گئی۔ وہ ایک لمحہ تھا' ایک ثانیہ تھا یا ایک ہزار سال تھے؟ روشنی کی یہ کرن تو کسی کسی خوش نصیب کے پاس آ کر اسے اپنی طرف بلاتی ہے۔ جو اس روشنی میں روشنی بن کر گم ہو جاتے ہیں وہ زندگی کے نور کو پا لیتے ہیں' جو سوچتے رہ جاتے ہیں پھر ان کی قسمت

میں بڑھاپے اور موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

گارڈ نے سیٹی دی۔ میں چونک کر ٹرین کی طرف دوڑا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر سے کھسک رہی تھی۔ میں دوڑ کر اپنے ڈبے میں گھس گیا۔ میں کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ مگر وہ لڑکی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اب بھی اس سے ملاقات نہیں ہوگی۔ ایک ننھا سا قطرہ سمندروں کے سمندر میں جا ملا تھا۔ آج بھی اس لڑکی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یاد کرتا ہوں تو وہ اسی طرح کتھئی رنگ کی ساڑھی پہنے ناریل اور اگربتی ایسی خوشبو اڑاتی میرے قریب سے گزر جاتی ہے۔ پھر پل کی سیڑھیاں چڑھ کر میری طرف دیکھتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی ہم اچانک محسوس کرتے ہیں کہ جہاں ہم کھڑے ہیں وہاں ایک بار پہلے بھی کھڑے تھے جو آوازیں سن رہے ہیں کبھی پہلے بھی سنی تھیں۔ جو شکل ہم دیکھ رہے ہیں کبھی پہلے بھی دیکھی تھی' کہاں؟ کب؟ یاد نہیں آتا۔ ایک ایسا پردہ گرا ہے جسے ہم اٹھا نہیں سکتے۔

ٹرین دھڑ دھڑاتی شور مچاتی بھاگی جا رہی تھی۔ ترچنا پلی بہت پیچھے رہ گیا۔ نیلور کا قدیم اور تاریخی شہر آیا تو میرے ڈبے میں ایک دبلا پتلا مدراسی لڑکا بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس نے پٹ سن کا ایک تھیلا پکڑ رکھا تھا۔ ہم تقریباً ہم عمر تھے۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا میں پنجاب سے آرہا ہوں؟ پنجابیوں کے رنگ کھلے ہوتے ہیں اور وہ اپنے چوڑے ہڈ کاٹھ سے جنوبی ہند میں فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔ میں نے تقریباً سارے ہندوستان کی سیاحت کی ہے۔ جنوبی ہند میں ہر جگہ پنجابیوں سے لوگ ڈرتے ہیں کہ یہ ابھی مرنے مارنے پر اتر آئیں گے۔ اس لڑکے کا نام کرشن تھا۔ وہ نیلور میں پڑھتا تھا اور کارتیکا میں اپنی بڑی بہن سے ملنے جا رہا تھا۔ ہماری بہت جلد دوستی ہو گئی۔ ہمارے ڈبے میں ایک تلک دھاری سادھو بیٹھا لوگوں کو کچھ اپدیش دے رہا تھا۔ کرشن نے مجھے بتایا کہ یہ سادھو سبرامینم ہے۔ کندرگام میں شوا کے بیٹے کنداسوامی کا بہت بڑا مندر ہے۔ کنداسوامی کے بھگتوں کو تامل میں سبرامینم کہتے ہیں۔

کارتیکا کا ریلوے اسٹیشن آیا تو کرشن نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کیا اور پھر کبھی نہ ملنے کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا۔ کہیں دوپہر کے وقت منڈاپم کیمپ نام کا ایک ویران سا اسٹیشن آ گیا۔ آج کل جبکہ سری لنکا میں تامل تارکین وطن اور سنہالیوں کے مابین خانہ جنگی ہو رہی ہے تو میں نے ایک خبر پڑھی جس میں بتایا گیا تھا کہ سری لنکا سے آئے ہوئے تامل مہاجرین کو منڈاپم کیمپ میں ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ایک مدت کے بعد منڈاپم کیمپ کا نام پڑھا تو پرانی یادیں ایک بار تازہ ہو گئیں اور گزرے ہوئے دنوں کے مناظر ایک فلم کی طرح آنکھوں میں پھر گئے۔

بہرحال میں آپ کو دوبارہ ۱۹۴۵ء کے منڈاپم کیمپ لیے چلتا ہوں۔ اس ریلوے اسٹیشن کی ٹین اور لوہے کی چھت دھوپ میں گرم ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ کولمبو جانے والے مسافروں کو یہاں ٹیکے لگائے جائیں گے۔ منڈاپم کیمپ بڑی خشک ویران اور بور جگہ ملی۔ اسٹیشن کے پاس ہی ٹین کی چھت والی ایک لمبی چوڑی بارک تھی۔ کولمبو جانے والے سارے مسافر یہاں جمع ہو گئے۔ باری باری سب کو ٹیکہ لگایا گیا۔ کچھ تامل لڑکے یہاں کیلے کے پتوں میں لپٹے ہوئے پیکٹ فروخت کر رہے تھے۔ وہ بار بار کہتے۔ "بریانی پارسل۔۔۔۔۔۔۔۔بریانی پارسل" میں نے ایک پیکٹ خریدا۔ شاید آٹھ آنے کا تھا۔ پیکٹ گرم تھا۔ اسے کھولا تو کیلے کے سبز پتے میں گرم گرم خوشبودار بریانی مسکرا رہی تھی۔ اتنی لذیذ بریانی میں نے سارے جنوبی ہند میں کہیں نہیں کھائی تھی۔ ٹین کی چھت والی بارک میں سخت گرمی تھی۔ آس پاس کہیں سبزہ بھی نہیں تھا۔ ریت کا میدان تھا۔ کہیں کہیں کواٹر سے بنے تھے جن کی چھت کھپریل کی تھی۔ دور کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے درخت آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے سمندر کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ یہاں سے مغربی اور مشرقی گھاٹ کے سمندر زیادہ دور نہیں تھے۔ ہندوستان کی تکون آ رہی تھی۔ مشرقی اور مغربی گھاٹ کے سمندر آپس میں ملنے والے تھے۔ خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کی لہریں مل کر بحر ہند میں مدغم ہونے والی تھیں۔ ہوا گرم ہو گئی تھی۔ برآمدے والی ٹین کی چھت بھی تپ رہی تھی۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد یہاں سے چھٹکارا نصیب ہوا اور ٹرین منڈاپم کیمپ سے آگے روانہ ہوئی۔ اب ہماری دونوں جانب زمین زیادہ تر ریتلی تھی۔ ہرے بھرے کھیتوں اور سرسبز گھنے جنگلات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں کیلے اور ناریل کے جھنڈ ضرور دکھائی دے جاتے تھے۔ ٹرین خراٹے بھری ہندوستان کی جنوبی تکون کے آخری ریلوے اسٹیشن دھنش کوڈی کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات کبھی نہیں آ سکتی تھی کہ کولمبو میں ایک پراسرار کیسری آنکھوں اور براؤن ہونٹوں والی ایک سانولی لڑکی میرا انتظار کر رہی تھی۔

مرادانہ ریلوے اسٹیشن

ٹرین ہندوستان کی جنوبی تکون کی طرف بڑھ رہی تھی۔

دونوں جانب سے ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحل ایک نقطے پر مرکوز ہونے کے لیے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ نیچے خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے سمندروں کا باہمی اتصال ہونے والا تھا۔ ٹرین کی رفتار کافی تیز تھی۔ جنوبی تکون کے قریب ایک جگہ سمندر ساحل کو کاٹ کر کافی اندر آ گیا تھا۔ یہاں ایک بہت بڑا آہنی پل تھا جو سمندر سے باہر ابھری ہوئی چٹانوں کے اوپر بنایا گیا تھا۔ ٹرین گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس پل پر سے گزرنے لگی۔ میں نے کھڑکی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ سمندر کی بپھری ہوئی موجیں چٹانوں

سے ٹکراتی ہوئی ریل کے دوڑتے پہیوں کو دھو رہی تھیں۔ اس پل پر گاڑی دیر تک چلتی رہی۔ پل ختم ہوا تو ریتلا میدان آ گیا جس کے دونوں جانب کچھ فاصلے پر وسیع و عریض سمندر دکھائی دینے لگا تھا۔ ٹرین کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ کہیں کہیں ناریل اور تاڑی کے اونچے چھریرے درخت نظر آ رہے تھے۔ ٹرین دھنش کوڈی پہنچ کر رک گئی۔ یہ ہندوستان کی جنوبی تکون کا آخری اسٹیشن تھا۔ آج کل یہ علاقہ تامل ناڈو میں ہے۔ جہاں ہماری ریل گاڑی جا کر کھڑی ہوئی تھی وہ پلیٹ فارم بھی تھا اور بندرگاہ دھنش کوڈی کی جیٹی بھی تھی۔ اس قسم کا مخلوط ریلوے اسٹیشن اور بندرگاہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ ریل کی ایک جانب سمندر تھا اور جیٹی کے بالکل ساتھ ایک بحری جہاز کھڑا تھا۔ اس بحری جہاز کا میں نام بھول گیا ہوں۔ مگر جہاز کی شکل مجھے یاد ہے جیسے میرے ماضی کے بحر ظلمات میں وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو کر رہ گیا ہو۔ ایسے ہی مجھے لنکا' کیرالہ اور سراندیپ کی گہری سانولی کیسری آنکھوں اور براؤن ہونٹوں والی اپسراؤں کے نام بھول گئے ہیں مگر ان کی شکلیں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یادوں کی وادیوں میں وہ نیلی جھیلوں کے کنارے بیٹھی اپنے لمبے سیاہ بالوں میں کنول کے پھول سجاتی دکھائی دیتی ہیں۔ خوشبو کا ایک لطیف سا جھونکا' اڑان بھرتے پرندے کا منظر' جنی گندھا کی سفید کلیوں کی ایک جھلک اور آدھ کھلے زرد گلاب کا دیدار اور کسی پرانے محبت بھرے گیت کی اداس آواز مجھے ان کے پاس نیلی جھیلوں کے کنارے پہنچا دیتی ہے اور میں جھیل کے نیلے شفاف آئینے میں زرد چاند کا خاموش چہرہ دکھائی دیتا ہوں اور ماضی کی گپھاؤں میں کسی شکنتلا' کسی اروشی کی مہک اڑاتی سرگوشیاں سنتا ہوں۔ یہ گیت سنتھالی دوشیزائیں چاندنی رات میں رقص کرتے گا رہی تھیں۔ میرا ایک دوست مجھے گیت کا ترجمہ کر کے سناتا جا رہا تھا۔

سنو' سنو۔۔۔۔۔ہم جنگل کی آوازیں ہیں

سنو! ہم تمہیں اپنے پاس بلا رہی ہیں

تم ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟

سنتھا کے سرخ پھولوں سے رس ٹپک رہا ہے

کیا تم نہیں آؤ گے؟

سمندری جہاز پر سیڑھی لگا دی گئی۔ ٹرین سے اتر کر مسافر جہاز پر سوار ہونے لگے۔ بھارت اور لنکا کے درمیان سمندر ہے۔ یہاں دو سمندر آ کر ملتے ہیں اور بحر ہند میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ سمندری فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ میں بھی اپنا خاکی ٹریول بیگ کاندھے سے لٹکائے جہاز پر سوار ہو گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور آسمان کا رنگ بنفشی ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی ۔ان دنوں بھارت اور لنکا دونوں ممالک پر انگریزوں کی حکومت تھی ۔لنکا کے لیے کوئی پاسپورٹ تو نہیں تھا لیکن منڈاپم کیمپ نامی ریلوے اسٹیشن کی ایک بارک میں چیکنگ ہوتی تھی اور ایک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ ایشوع کیا جاتا تھا۔ یہ سرٹیفکیٹ ہی ایک طرح کا پرمٹ تھا۔لنک میں داخل ہونے کا۔ان دنوں لنکا کا نام سیلون تھا۔اس وقت میری عمر کیا تھی' یہ مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ میں گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر سے میٹرک کا امتحان دے کر گھر سے بھاگ کر لنکا جا رہا تھا۔اور نتیجہ میں نے لکھنو ریلوے اسٹیشن پر انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں دیکھا تھا۔میں پاس ہو گیا تھا۔

جب شام گہری ہو گئی تو سمندری جہاز پر لگی ہوئی سیڑھی اٹھا دی گئی ۔ جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے اور جہاز نے آہستہ آہستہ بندرگاہ کے وارف سے کھسکنا شروع کر دیا۔تھوڑی دیر بعد یہ سمندری جہاز رات کے اولیں اندھیرے میں تاریک ہوتی موجوں کو چیرتا ہوا لنکا یعنی سیلون کی طرف بڑھ رہا تھا اور انڈیا کے تکونی ساحل کی روشنیاں دور ہو کر جھلملانے لگی تھیں ۔ جب یہ روشنیاں نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئیں تو دوسری طرف سے سری لنکا کے ساحل کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ سمندری سفر پون گھنٹے کا تھا۔ جہاز لنکا کے شمال مغربی ساحل پر واقع چھوٹی سی بندرگاہ 'تالی منار' کے ساتھ جا لگا۔ آج کل سری لنکا میں جو نسلی گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ اس ضمن میں منار نامی بندرگاہ کا نام اخباروں میں بہت آتا ہے۔ یہ وہی بندرگاہ منار ہے جس کا اصلی نام تالی منار ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا لائٹ ہاؤس بھی ہے۔آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال برس پہلے بھی یہاں ایک چٹان کی چوٹی پر لائٹ ہاؤس موجود تھا جو دور سے آنے والے بحری جہازوں کو سمندر کی سطح سے ابھری ہوئی نوکیلی چٹانوں سے خبردار کرتے ہوئے ان کی راہنمائی کرتا تھا۔

قدیم عرب تاجر اپنے جہاز لے کر اسی بندرگاہ سے ہوتے ہوئے جاوا سماٹرا کی طرف سفر کیا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ منار ان عربوں کا رکھا ہوا نام ہے۔ کیونکہ یہ عربی کا نام ہے اور نور کا اسم ظرف ہے یعنی نور کی' روشنی کی جگہ۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر میں یہ گرامر کی خشک سنگلاخ زمین میں کہاں نکل گیا۔ مجھے تو آپ کو سری لنکا کی اس گہرے سانولے رنگ کی لڑکی کی داستان محبت سنانی ہے جس کی آنکھیں کیسری رنگ کی تھیں اور ہونٹ گہرے براؤن تھے جو اپنی بات آواز سے شروع کر کے سرگوشی پر ختم کرتی تھی ۔اب میں اس داستان محبت کو آگے بڑھاتا ہوں۔ تالی منار کی یہ سیلونی بندرگاہ اتنی آباد نہیں تھی ۔ایک جیٹی تھی جس کی اونچی چھت والی عمارت میں روشنی ہو رہی تھی اور مزدور قلی لوگ جہاز پر سیڑھی لگنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ میں عرشے کے جنگلے کے ساتھ لگا لنکا کی شروع رات کی فضاؤں میں گہرے سانس لے رہا تھا۔ مرطوب فضا میں ناریل کی بوجھل مہک تھی ۔ جہاز پر سیڑھی لگی تھی تو سب سے پہلے جیٹی کا عملہ اوپر آیا۔ ہمارے ٹکٹ دیکھے۔ سامان واجبی سا چیک کیا اور چلے گئے۔ پھر مسافر نیچے اترنے لگے۔ یہاں بھی دھنش کوڈی کی طرح ایک

میٹر گیج کی سبز رنگ کی ٹرین جیٹی کی دوسری جانب کھڑی تھی۔ ہمیں اس ٹرین میں بیٹھ کر کولمبو جانا تھا۔ ٹرین کے پیچھے اندھیری رات میں ستاروں بھرے نیلے مرطوب استوائی آسمان کے پس منظر میں ناریل کے درخت ملایا سے آنے والی ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ میں نے ہاتھ لہرا کر ان درختوں کو سلام کیا۔ ناریل کے ان درختوں کی محبت ہی مجھے گھر سے بھگا کر لنکا کھینچ لائی تھی۔

درختوں کو سلام ۔۔۔۔۔۔۔ ناریل کے درختوں کو سلام ۔۔۔۔۔۔۔ کنداسوامی کے قدیم مندروں کی سیاہ چشم دیوداسیوں کو سلام!

میں کولمبو میل کے ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ ٹرین کی دوسری جانب شاید چائے کی دکانیں تھیں۔ کھپریل کی ڈھلانی چھتوں کے نیچے روشنی ہو رہی تھی اور سپیکر پر اس زمانے کی مشہور فلم ''رتن'' کے گانے کی آواز ہواؤں میں لہرا رہی تھی۔

''ساون کے بادلو

ان سے یہ جا کہو

تقدیر میں یہی تھا

ساجن میرے نہ رو''

یہ کسی غالب' میر یا ولی دکنی کے اشعار نہیں تھے۔ ان میں علم البیان' فلسفہ' حکمت اور معانی کی موشگافیاں نہیں تھیں۔ صرف ساون کے بادل سے کہا گیا تھا کہ میرے محبوب سے کہنا کہ آنسو نہ بہائے' ہماری قسمت میں جدائی ہی لکھی تھی۔ اس گیت کے بول سن کر میرا دل اداس ہو گیا۔ وہ زمانہ گرم گلابی محبتوں کا زمانہ تھا۔ ساون کے گرجتے بادلوں اور برسات کی جھڑیوں کا زمانہ تھا۔ مکان کی ڈیوڑھیوں میں جنم لیتی اور وہیں دم توڑتی محبتوں کا زمانہ تھا۔ بڑی دل سوزیوں اور رعنائیوں اور اداسیوں کا زمانہ تھا۔ تب ساون کے بادل ہجر نصیب عاشقوں کی دل گداز سرگوشیاں سن لیتے تھے اور میگھ دوت کر محبوباؤں تک ان کے پیغامات پہنچا دیا کرتے تھے۔ ان سے باتیں کرتے تھے۔ ہنستے تھے' روتے تھے' گرجتے تھے' برستے تھے اور پھر سماواروں سے اٹھتی چائے کی لطیف خوشبو سے ہم آغوش ہو کر حسن وشباب کی وادیوں میں اتر جاتے تھے۔ آج کوئی بادل کسی عاشق کا پیغام محبت لے کر نہیں جاتا۔ وہ گرجتا ہے' برستا ہے اور بستیوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اب نہ اس کی آنکھ سے محبت کا کوئی آنسو موتی بن کر گرتا ہے اور نہ اس کی رم جھم کی سرسرائیں سماواروں سے اٹھتی چائے کی خوشبو سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ لیکن میں تب کی بات کر رہا ہوں جب لنکا کے آسمان پر ساون کی گھٹائیں اُمڈ رہی تھیں۔ میں کولمبو میل کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا کھپریل کی چھت والے چائے خانے سے آتی فلم ''رتن'' کے

گیت کی آواز سن رہا تھا اور ساون کی ہلکی ہلکی رم جھم شروع ہو گئی تھی۔ ابھی لنکا کے مرطوب استوائی آسمان پر نیلے ستارے چمک رہے تھے اور اب انہیں سیاہ گھٹاؤں نے ڈھانپ لیا تھا اور فضا ناریل' اناناس اور گل مہر کی دھیمی خوشبوؤں سے لبریز ہو گئی تھی۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین کولمبو کی طرف روانہ ہو گئی۔

کولمبو میل ساری رات لنکا کے گھنے' تاریک اور پہاڑی جنگلوں میں چلتی رہی۔ یہ چھوٹی لائن کی ٹرین تھی مگر اس کی رفتار تیز تھی۔ درخت اس کے قریب سے ہو کر رات کے مرطوب اندھیرے میں زناٹے کے ساتھ پیچھے کو گزر جاتے۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ اندھیرے جنگلوں کی سیاہ کالی راتوں کی بارش' نظر نہ آنے والی بارش' رات رات بھر ہونے والی بارش میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا کہ بارش کا پانی ڈبے میں نہ آئے۔ کیونکہ وہاں دوسرے مسافر سو رہے تھے۔ میں شیشے کے ساتھ منہ لگا کر بارش میں بھیگتے جنگلوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر شیشے پر ڈبے میں جلتی روشنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ میں اٹھ کر ٹرین کے کاریڈور میں آ گیا۔ اور ایک کھلی کھڑکی میں سے برسات کی تاریک رات میں بھیگتے جنگلوں' جنگل کے درختوں' زنگ آلود چٹانوں' جھر جھراتے جھرنوں' شور مچاتے پہاڑی نالوں اور ناریل' دیودار اور ساگوان کے گنجان درختوں کو تیزی سے پیچھے بھاگتے دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے بھیگتے' شور مچاتے پہاڑوں ایسے سائے پیچھے کی طرف جاتے نظر آ رہے تھے۔ میرا چہرہ جزیرے کے گھنے جنگل کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اور کبھی اس کھڑکی سے دیو پیکر درختوں سے ٹکراتی تیز بارش کی آواز سننے کی کوشش کرتا۔ رات کے پچھلے پہر میں اپنی سیٹ پر آ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بارش اور ٹرین کی آواز نے مجھے سلا دیا۔

آنکھ کھلی تو باہر دن نکل آیا تھا۔ آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ٹرین بانس کے سرسبز و شاداب جنگلوں اور کنول کے رنگ برنگ پھولوں سے بھری ہوئی جھیلوں کو پیچھے چھوڑتی اپنی منزل کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ کھڑکی میں سے مرطوب سبزے کی تر و تازہ ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ اس میں طرح طرح کے پھولوں' درختوں' جھیلوں اور زرد کیلے کے سبز پتوں اور اناناس کی خوشبو تھی۔ ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک اسٹیشن پر رک گئی۔ سنہالی اور انگریزی زبان میں اسٹیشن کا کوئی نام لکھا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ ایک لمبا پلیٹ فارم تھا جس پر سرخ بجری بچھی تھی۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف جنگلے کے پیچھے کیلے اور بانس کے درختوں کے جھنڈ اوپر کو جھکے ہوئے تھے۔ کچھ لڑکیاں اناناس اور سگریٹ بیچ رہی تھیں۔ یہ سنہالی لڑکیاں تھیں۔ بالوں میں کنول کے پھول لگے تھے۔ ننگے پاؤں تھیں۔ پنڈلیوں تک آتی سفید دھوتیاں کس کر باندھی ہوئی تھیں۔ اوپر کے جسم چھوٹی چھوٹی سفید کرنڈی کی کرتیوں میں چھپے تھے۔ وہ "سگریٹ سر" "پائن ایپل سر" کہتی ڈبے کے قریب سے گزر جاتیں۔

پائن ایپل کی قاشیں کاٹ کر کیلے کے پتوں پر سجا رکھی تھیں۔ بارش کی پھوار میں وہ بھیگ رہی تھیں۔ کیلے کے سبز پتوں میں سجی زرد اناس کی قاشیں پیچھے کی طرف ہٹنے لگیں۔ ماضی کی طرف جانے لگیں۔ ٹرین ایک بار پھر اونچی نیچی وادیوں' جنگلوں' بانس ساگوان اور ناریل کے جھنڈوں میں سے گزرتی کولمبو کی طرف بڑھنے لگی۔ میں بہت جنگلوں سے گزرا تھا اور میں نے جنگل کو ہر موڈ میں دیکھا تھا۔ اس کی وحشتیں اور خونخواریاں اور دلنوازیاں بھی دیکھی تھیں مگر سری لنکا کے گھنے جنگلوں کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ بارش کی پھوار ہمارے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔ پھر جنگلوں کا سلسلہ آہستہ آہستہ بے معلوم انداز میں دھان کے کھیتوں اور پھل دار باغوں میں تبدیل ہوتا گیا۔ اب چائے کے باغات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہری بھری ڈھلانوں پر چائے کے باغوں میں سرخ چھتوں والے گودام نظر آ جاتے۔ دھان کے کھیتوں میں سنہالی مرد عورتیں دھان کی بوائی میں مصروف تھیں۔ کبھی کوئی بستی بھی گزر جاتی۔ ٹرین ایک بند ریلوے پھاٹک کو پیچھے چھوڑتی ہوئی گزری تو دو چھکڑے اور ایک بس کھڑی نظر آئی۔ بس کے اوپر زرد کیلوں کے گچھے لدے ہوئے تھے۔ مسافر اپنا اپنا سامان درست کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ کولمبو آ رہا ہے۔ ٹرین کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ وہ کولمبو کے مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ ڈھلانی سرخ چھتوں والے بنگلوں کے اوپر ناریل اور تاڑ کے درخت لہرا رہے تھے۔ پھر ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی کولمبو کے دوسرے بڑے ریلوے اسٹیشن مرادانہ کے عظیم الشان اونچی چھت والے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔



سری لنکا کا دارالحکومت ☆ کولمبو

کولمبو نام کا کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔

اس عظیم الشان شہر اور سری لنکا کے دارالحکومت کے دو بڑے ریلوے اسٹیشن ہیں۔ایک کا نام فورٹ اور دوسرے اسٹیشن کا نام مرادانہ ہے۔ ہماری ٹرین مرادانہ ریلوے اسٹیشن پر رکی تھی۔ بہت بڑا اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم پر بڑی بڑی چہل پہل تھی۔ سنہالی لوگوں کے قد چھوٹے' رنگ سبزی مائل گہرے سانولے اور جسم دبلے پتلے تھے۔ زیادہ تر دھوتی کرتے میں ملبوس تھے۔ اکثر پاؤں سے ننگے تھے۔عورتوں کے رنگ بھی گہرے سانولے اور سبزی مائل کالے تھے۔تقریباً ہر دوسری عورت کے بال گہرے سیاہ اور چمکیلے تھے اور جوڑوں میں پھول لگے تھے۔عورتوں کا لباس ساڑھی تھا۔ کچھ عورتیں انگریزی لباس میں بھی ملبوس تھیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں کی عورتیں ریشمی ساڑھیوں اور رنگین کرتیوں میں ملبوس تھیں۔ایک ٹکٹ چیکر ننگے پاؤں سفید وردی میں میرے قریب سے گزر گیا۔میرے پاس صرف ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ہی تھا جس کو میں جب اور جہاں چاہے چھینک سکتا تھا۔انڈین کرنسی ٹالی مینار میں ہی سیلونی کرنسی میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ روپیہ تو وہاں انڈین ہی چلتا تھا صرف کریانے میں سینٹ چلتے تھے۔ میں اٹیچی کیس اٹھائے اسٹیشن کی لابی میں آ گیا۔ سامنے ایک کشادہ سڑک تھی جس کی دونوں جانب عالیشان جدید طرز کی بلند و بالا عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ سڑک پر سے کاریں اور سرخ رنگ کی بسیں گزر رہی تھیں۔فٹ پاتھ پر ایسے درخت جھکے ہوئے تھے جن میں لال لال پھول کھل رہے تھے۔ بارش کی رم جھم اسی طرح لگی ہوئی تھی۔ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی گاڑی میرے بالکل قریب لا کر کھڑی کی اور انگریزی میں بولا۔''ہوٹل لے چلوں سر؟''

میں نے اسے کہا مجھے کسی سستے سے ہوٹل میں لے چلو کیونکہ میں ٹورسٹ ہوں۔ وہ خوش ہوا۔ ہندوستانی میں بولا۔''بابو ایک دم سستے والے میں لے چلے گا۔'' میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور ٹیکسی کولمبو شہر کی خوبصورت سڑکوں پر سے گزرتی ایک ایسے ہوٹل کے سامنے آ کھڑی ہو گئی جس کا چائے خانہ بھی تھا اور وہاں بڑے زور شور سے ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔

پانچ روپے ادا کرنے پر مجھے ایک کمرہ مل گیا جس کی دیواروں کا چونا برسات کی وجہ سے جھڑ رہا تھا۔ غسل خانہ باہر کونے میں تھا جس کی ٹونٹی کھلی تھی اور بند نہیں ہوتی تھی۔ نہانے کے بعد میں نیچے چائے خانے میں آ گیا۔ سبزی چاول کھائے اور اپنے بوسیدہ کمرے

میں آکر پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایک طویل سفر کا تھکا ہوا تھا۔ سبزی چاول کھائے اور اپنے بوسیدہ کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایک طویل سفر کا تھکا ہوا تھا۔ گھوڑے بیچ کر سو گیا اور شام کو اٹھا۔ طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے مرطوب ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ میں کولمبو شہر کی سیر کو نکل آیا۔ کولمبو کی سڑکیں مجھے بمبئی کلکتہ کی سڑکوں سے مختلف نہیں لگ رہی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کولمبو کی سڑکوں کے دورویہ بڑے ہی خوبصورت درخت تھے جن پر لال لال پھول کھلے تھے۔ ایک منزلہ ڈھلانی چھتوں والے مکانوں' کوٹھیوں اور بنگلوں کے پائیں باغوں میں ناریل کے درخت سر اٹھائے شام کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ایک جگہ سینما ہاؤس کے باہر بڑا رش تھا۔ کوئی انگریزی فلم چل رہی تھی۔ سڑکیں صاف ستھری تھیں۔ دکانوں اور عمارتوں میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں گیلی تھیں۔ فضا میں ناریل سگار اور خوشبودار تمباکو کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی۔ عورتیں کرتی کے نیچے دھوتیاں کس کر باندھے چلی جا رہی تھیں۔ کچھ عورتوں نے لمبے انگریزی گاؤن پہن رکھے تھے۔ چائے کی دکانوں کے آگے زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ کچھ دیر تک کولمبو کی کشادہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کولمبو میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے لوگ کاروبار کرتے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک اس جزیرے میں رہنا ہے اور اس کی سیر و سیاحت کرنی ہے تو کہیں چھوٹی موٹی نوکری کر لوں تاکہ خرچ نکل آئے۔ میں نے ہوٹل والے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ کولمبو کے وسطی علاقے میں ایک محلہ ہے جس کا نام پیٹہ (Patta) ہے جہاں پنجابیوں اور پٹھانوں کی بھی آڑھت کی دکانیں ہیں۔ میرے لیے اتنی قلیل معلومات بہت تھی۔ دوسرے روز میں پٹہ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ بڑا گنجان علاقہ تھا اور یہاں اجناس کی منڈی تھی۔ اس منڈی کا ننانوے فیصد کاروبار مدراسیوں یعنی تامل نژاد باشندوں' پنجابیوں اور پٹھانوں کے ہاتھ میں تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی ایک وجہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سیلون یعنی سری لنکا کے سنہالی باشندے فطری طور پر سست اور کاہل ہوتے ہیں۔ وہ مدراسیوں' پنجابیوں اور پٹھانوں کی طرح جفاکش اور سخت جان نہیں ہوتے۔ شاید اس کی وجہ سری لنکا کی مرطوب آب و ہوا بھی تھی جس کا وہاں کے اصلی باشندوں پر صدیوں سے اثر تھا۔ تامل پنجابی اور پٹھان باہر سے آئے تھے اور لنکا کے مرطوب اثرات ابھی ان کے مزاج میں اتنی شدت سے داخل نہیں ہوئے تھے۔ لنکا میں یہ بات بڑی مشہور تھی کہ دھان لنکا کے سنہالی بوتے ہیں اور کٹائی مدراس کے تامل آ کر کرتے ہیں۔

یہاں حاجی جبار خان نامی پشاور کے رہنے والے غلے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کی دکان کافی بڑی تھی۔ میں نے جا کر انہیں سلام کیا اور بتایا کہ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔ سیر و سیاحت کا شوق کولمبو کھینچ لایا ہے۔ نوکری مل جائے تو سیر و سیاحت میں

آسانی ہوجائے گی۔ وہ مسکرائے۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! تم ہمارے بچے ہو، ہم سے جو ہو سکے گا تمہارے لیے کریں گے۔"

حاجی صاحب نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر مجھے اپنی دکان پر نوکر رکھ لیا۔ وہیں پیٹہ کے علاقے میں قریب ہی ایک بلڈنگ میں پندرہ روپے کرائے پر ایک بوسیدہ سا کمرہ بھی لے دیا۔ میں نے ہوٹل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس اٹھایا اور وہاں آ گیا۔ میرا کام سٹور میں جمع شدہ مال کی روزانہ چیکنگ اور بیوپاریوں کی کمیشن کا اندراج تھا۔ حاجی صاحب کا ایک چھوٹا بھائی بھی ان کے کاروبار میں شامل تھا۔ اس کا نام گل جان تھا۔ بڑا خوش شکل اور باغ و بہار آدمی تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ میں صبح آٹھ بجے دکان پر آ جاتا۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ شام پانچ بجے دکان پر اپنی ڈیوٹی ختم کر کے ہوٹل میں آ کر منہ ہاتھ دھوتا اور کولمبو کی سیر کو نکل جاتا۔ کولمبو شہر کی خوبصورتی اور نفاست نے مجھے کافی متاثر کیا تھا۔ ہمارا پیٹہ کا علاقہ اجناس کی منڈی ہونے کی وجہ سے گنجان آباد اور گندا تھا مگر شہر کا دوسرا علاقہ بہت دلکش اور فراخ تھا۔ شاندار ہرے بھرے بنگلے بلند پختہ عمارتیں، کشادہ سڑکیں اور خوبصورت بیچ یعنی ساحل سمندر جو دور تک چلا گیا تھا۔ گال نام کی سڑک چوڑی چکلی اور بے حد طویل تھی۔ اس کی ایک جانب بلند عمارتیں تھیں، دوسری جانب ناریل اور کیلے کے درختوں میں گھرے ہوئے بنگلے اور ان کے پیچھے ناریل کے باغ اور پیچھے سمندر تھا۔

حاجی صاحب کے ہاں نوکری کرتے مجھے دو مہینے گزر گئے تھے۔ غلے اور اجناس میں رہ کر مجھے اپنے اوپر کبھی چنے کی دال کا گمان ہوتا کبھی محسوس ہوتا کہ میں گندم کی بوری ہوں یا پھر مونگ کی دال ہوں۔ ویسے بھی اس سے زیادہ دیر تک نوکری کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میں کسی دوسری فضا میں پرواز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ حاجی صاحب کے بھائی کا شاعر اور باغ و بہار ہونا میرے کام آ گیا۔ ان کا ملنا جلنا وہاں کے شاعروں اور ادیبوں سے بھی تھا۔ میں اس زمانے میں افسانے وغیرہ بالکل نہیں لکھتا تھا۔ بس ڈائری لکھنے اور منٹو بیدی، کرشن اور قرۃ العین کے افسانے شوق سے پڑھنے کا جنون تھا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی فوجیں مقبوضہ علاقوں میں مقیم تھیں۔ ان کی تفریح کے لیے امریکیوں نے ریڈیو سی ایک (Radio Seac) سیلون کے نام سے کولمبو کی ایک کوٹھی سے روزانہ تین گھنٹے کا پروگرام شروع کر دیا۔ اس کی ایک سروس انگریزی میں تھی اور دوسری اردو میں۔ اردو سروس سے تامل تلنگو، مرہٹی، بنگالی اور نیپالی گانے نشر ہوتے تھے کیونکہ انگریز کی فوج میں ان تمام علاقوں کے لوگ موجود تھے۔ ایک روز حاجی صاحب کے بھائی مجھے ریڈیو سیلون لے گئے وہاں وہ ایک مشاعرہ پڑھنے گئے تھے۔ انہوں نے میرا تعارف ریڈیو کے انچارج سے کرایا جن کا نام کمال صاحب تھا۔ وہ ریڈیو سیلون کی اردو سروس کے انچارج تھے۔ ادبی ذوق میرے اندر موجود تھا۔ کمال صاحب

امرتسر کے رہنے والے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں بھی امرتسر کا ہوں تو امرتسر کے پانی نے جوش مارا' بولے۔ ''تم ہمارے لیے چھوٹے چھوٹے سکٹ لکھ سکتے ہو؟''

مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ سکٹ کیا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ کوئی لکھنے کی چیز ہوگی' دیکھ لیا کروں گا' ایسی کون سی بات ہے۔ کمال صاحب نے مجھے دوسرے روز آنے کو کہا۔ میں دوسرے روز حاجی صاحب سے چھٹی لے کر ریڈیو سیلون پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ مجھے ہندوستانی فوجیوں کے لیے دو لطیفے لے کر ان کے چھوٹے چھوٹے فیچر بنانے ہوں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے دو لطیفے اور کافی کا ایک پیالہ بنا کر دیا۔ میں نے دس پندرہ منٹ میں انہیں چار چار صفحوں کے دو فیچر بنا کر دے دیئے۔ وہ بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔ ''تم ہمارے کنٹریکٹ پر کیوں نہیں آجاتے؟''

مجھے کنٹریکٹ کی سمجھ نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ''حاجی صاحب بڑے نیک دل انسان ہیں مگر میں وہاں آٹے دال کا حساب کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔''

کمال صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''ارے برخوردار! ہم تمہیں اپنے پاس تین سو روپے کے کنٹریکٹ پر رکھ لیتے ہیں۔ بس آج ہمارے پاس آ کر جوائن کر لو۔''

تین سو روپے ۱۹۴۵ء میں اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ میں نے حاجی صاحب سے بات کی تو انہوں نے مجھے خوشی سے اجازت دے دی۔ میں نے ریڈیو سیلون پر نوکری شروع کر دی۔ ایک ہفتہ میں ہوٹل میں ہی رہا۔ اس کے بعد کمال صاحب نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مجھے بوریلا جنکشن کے علاقے میں آوٹس پیلس نامی ایک لین کی کوٹھی میں ایک کمرہ بیس روپے ماہوار پر کرائے پر دلوا دیا۔ یہ کوٹھی مسز جونز نامی ایک ادھیڑ عمر ڈچ عورت کی ملکیت تھی جس کا خاوند سیلون ٹی کا منیجر تھا۔ مسٹر جونز بڑا بھولا بھالا آدمی تھا۔ گھر میں چھٹی کے دن نیکر پہنے رہتا۔ شام کو کوٹھی کے لان میں بیٹھ کر کولمبو کے مشروب ایرق یا عرق سے دل بہلاتا۔ اس کی بیوی مسز جونز بھی اس سے پیچھے نہیں تھی۔ صرف ایک لمبا گاؤن پہنے دن بھر کوٹھی کے کمروں میں گردش کرتی رہتی۔ سگریٹ انگلیوں میں سلگ رہا ہوتا۔ ذرا کی ذرا برآمدے میں آتی تو اپنے دونوں لڑکوں ڈیوڈ اور ایلن کو پکارنے لگتی۔ یہ دونوں لڑکے بھی آفت کے پرکالے تھے۔ اسکول سے آتے ہی غلیل لے کر درختوں پر بیٹھی بلبلوں اور ناریلوں کے نشانے لگانا شروع کر دیتے۔

مسز جونز بے تحاشا سگریٹ پیتی تھی۔ سامنے والی کوٹھی میں اس کا ایک رشتے دار انجینئر رہتا تھا جس کی ایک آنکھ بیٹھی ہوئی تھی اور مدہوش ہو جانے پر اس کی اس بیٹھی ہوئی آنکھ سے مسلسل پانی بہنا شروع ہو جاتا تھا۔ وہ ہر روز شام کے وقت عرق مشروب لے کر آ

جاتا۔مسز جونز ویسے بڑی کنجوس خاتون تھی مگر مشروب پینے کے بعد شاہ خرچ بن جاتی تھی۔اس کا دل گداز ہو جاتا۔وہ بات بات پر آنسو بہانے لگتی اور اپنے پیکٹ سے سگریٹ نکال نکال کر دوسروں کو پیش کرتی۔اس کی بائیں گال کا مسہ کاسنی رنگ کا ہو جاتا۔وہ اپنے دونوں بچوں کو بلا کر بڑا پیار کرتی اور جیب سے ساری نقدی نکال کر ان میں بانٹ دیتی لیکن صبح جب وہ اپنے ہوش و حواس میں آتی تو دونوں لڑکوں سے رات کی دی ہوئی ایک ایک پائی واپس لے لیتی اور پھر ان سے یہ بھی پوچھتی کہ رات میں نے کس کس کو سگریٹ پیش کئے تھے اور کس نے میرے کتنے سگریت پیئے تھے۔وہ سب کا حساب رکھتی تھی اور ان تمام رشتے داروں سے سارے سگریٹ کسی نہ کسی طرح وصول کر لیتی تھی۔

مسز جونز کی دادی ہالینڈ سے ترک وطن کر کے کولمبو آئی تھی۔مسز جونز کولمبو میں پیدا ہوئی تھی۔وہ انگریزی ڈچ اور سنہالی زبانیں بڑی روانی سے بولتی تھی۔مسز جونز کی والدہ نے بوریلا جنکشن میں بہت سی زمین خرید کر وہاں آمنے سامنے کوٹھیاں بنوالی تھیں جن میں زیادہ تر ان کے رشتے دار مقیم تھے اور مسز جونز کو برائے نام کرایہ دیتے تھے۔مسز جونز س ہمیشہ لمبے سے پرانے گاؤن میں ملبوس رہتی تھی۔میں نے اسے خوبصورت لباس میں کبھی نہیں دیکھا۔کوٹھی میں وہ ننگے پاؤں پھرا کرتی۔بازار جاتے ہوئے چپل پہن لیتی تھی۔ گردن پر بالوں کا جوڑا بنا کر رکھتی جو سنہالی عورتوں کا دستور ہے۔مسز جونز کا قہقہہ بڑا زندگی سے بھرپور تھا۔اس عمر میں ایسا دل افروز اور جگر شگاف قہقہہ میں نے کم عورتوں کو لگاتے دیکھا ہے۔شروع شروع میں وہ مجھے خاطر میں نہ لاتی تھی۔لیکن جب مجھے ریڈیو سیلون کی جانب سے فوجی کینٹین یعنی نافی (Nafi) پر انتہائی سستے داموں سگریٹ ٹن فروٹ کا راشن ملنے لگا تو مسز جونز نے میری آؤ بھگت شروع کر دی۔وہ وقت بے وقت لیے قتلمہ سا بنا کر لے آتی اور کہتی۔

"مسٹر حامید میں نے یہ تمہارے لیے بنایا ہے۔"

وہ ناشتہ مجھے اپنے ڈائننگ ہال میں کرواتی۔میرے بعد میرے کمرے کی صفائی کرواتی۔چھٹی کے دن کھانا بھی باہر نہ کھانے دیتی۔یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ میں ہفتے کے دن ملٹری کینٹین سے جب سگریٹ وغیرہ کا راشن لاتا تو مسز جونز کو سینئر سروس سگریٹ کے چار بڑے پیکٹ اور چینی کے دو پیکٹ دینا نہ بھولتا تھا۔سینئر سروس سگریٹ کی تو وہ دیوانی تھی۔یہ سگریٹ مجھے بھی بے حد پسند تھے۔اسی زمانے میں یہ سگریٹ ناپید ہو گئے تھے۔ویسے ملٹری کینٹین سے گولڈ فلیک کا ٹن ہمیں دس آنے میں ملتا تھا۔مسز جونز کے سامنے والی کوٹھی میں جو رشتے دار رہتے تھے ان میں ایک نوجوانی لڑکی کچھ بگڑے دل شرارتی بچے اور چند نوجوان اور بیزار صورت بوڑھے شامل تھے۔دو ایک موٹی عورتیں تھیں۔یہ سب نسلی اعتبار سے ہالینڈ کے رہنے والے تھے مگر کولمبو میں رہتے ہوئے انہیں ایک

صدی بیت گئی تھی۔ چنانچہ ان کے رنگ سبزی مائل بلکہ نیلاہٹ مائل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جنوبی ہنداور افریقہ میں تو میں نے سیاہ فام لوگ دیکھے مگر کولمبو میں پہلی بار ایسے لوگ دیکھے جن کا رنگ نیلی فام تھا۔ مسز جونز کے سامنے والے رشتے داروں کے بیزار شکل ٹولے میں جو لڑکی تھی اس کا نام ایلس تھا۔ جسم دبلا پتلا' ناک لمبی' بطخ کی طرح چلتی تھی اور اس کی آنکھ ہمیشہ پھڑکتی رہتی تھی۔ اس کی شادی اس نوجوان سے ہونے والی تھی جس کی آنکھ سے پانی بہتا رہتا تھا۔

بوریلا جنکشن کی ان کوٹھیوں کے درمیان والی سڑک چھوٹی سی تھی اور آگے جا کر بند ہو جاتی تھی اس پر زرد بجری بچھی تھی۔ ہر کوٹھی کے لان میں ناریل اور پپیتے کے درختوں کی بھرمار تھی۔ رات کو تیز ہوا چلتی تو دھپ دھپ ناریلوں کے گرنے کی آوازیں آتیں۔ چوک میں گوتم بدھ کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ جس کی گول چاردیواری میں باریک سنگی جالیاں نصب تھیں۔ میں اس مندر کے قریب سے گزرتا تو ان جالیوں میں سے نکلنے والی اگربتیوں اور لوبان کی مہک دور تک میرے ساتھ جاتی۔ یہاں سے ایک سڑک بدھ کے بڑے مندر کی طرف' ایک گال روڈ کی طرف اور ایک سڑک ہمارے ریڈیو سیلون کی عمارت کی طرف جاتی تھی۔ ریڈیو سیلون کولمبو میونسپل ہال والی گراؤنڈ کے سامنے دو منزلہ بنگلے میں واقع تھا۔ اس کے اندر والے لان میں ناریل آم اور شریف کے درخت اگے ہوئے تھے۔ یہ فوجی ریڈیو تھا۔ ایک سیکشن ہندی یعنی اردو تھا اور دوسرا امریکی سیکشن تھا جس کا انچارج ایک امریکی کرنل تھا۔ اردو سیکشن کے عملے میرے اور کمال صاحب کے علاوہ صوبیدار بوستان خان' حوالدار موہن سنگھ اور حوالدار کمرک پرکاش چند شامل تھے۔ بوریلا جنکشن کے چوک سے جو سڑک مشرق کی طرف جاتی تھی اس کا نام ٹمپل روڈ تھا۔ اس سڑک پر ٹرام چلتی تھی۔ اسی سڑک پر مہاتما بدھ کا ایک معبد بھی تھا۔ جس کے باہر تامل اور سنہالی عورتیں پھول بیچتی تھیں۔ ٹرام اس معبد اس کے سامنے سے گزرتی تو فضا میں لوبان کی تیز خوشبو ضرور آتی۔ ایک روز میں ٹرام میں بیٹھا ٹمپل روڈ سے گزر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک مکان کی بالکونی پر پڑی۔ وہاں گہرے سانولے رنگ کی ایک لڑکی کھڑی مجھے دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ دو سیکنڈ بعد ٹرام آگے نکل گئی۔ گردن موڑ کر دیکھا' عورت بالکونی میں نہیں تھی۔ میں حیران سا ہوا کیونکہ اس عورت کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چوک میں ٹرام سے اتر کر میں سڑک کراس کر رہا تھا تو یہ دیکھ کر میں ساکت سا ہو کر رہ گیا کہ وہی لڑکی فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ وہ اسی طرح میری طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اس کے مکان سے چوک تک دو تین فرلانگ کا فاصلہ تھا اور وہ ٹرام کی سپیڈ کے ساتھ اپنے مکان سے چل کر چوک تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

یہ لڑکی کون تھی؟

وہ ہجوم میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

یہاں میری پیاری سہیلی دفن ہے

کولمبو کی ٹمپل روڈ والی یہ سنہالی عورت یا لڑکی مجھے بڑی پراسرارگی اور اسراریت کا شروع ہی سے میں دلدادہ رہا ہوں۔ یہ بات میرے لیے کافی اسرار افزا تھی کہ ایک عورت بیک وقت دو جگہوں پر کیسے موجود ہو سکتی ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں اپنے ٹمپل روڈ والے مکان کے برآمدے میں بھی تھی اور دس سیکنڈ بعد میں نے اسے ٹمپل روڈ کے آگے جا جر بودھ معبد والے چوک میں بھی سڑک کراس کرتے دیکھا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے ہیلو ہیلو بھی کیا تھا۔ کیا وہ مجھے جانتی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ میں اس سے پہلے کبھی کولمبو نہیں آیا تھا۔ اور ٹمپل روڈ پر ٹرام میں سے گزرتے ہوئے میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ سمگلروں کے کسی گروہ کی رکن نہ ہو اور مجھے اپنے گروہ کے جال میں پھنسانا چاہتی ہو۔ خطرے کے اس امکان کے باوجود میں دوسرے روز ٹھیک اسی وقت پر ٹرام میں بیٹھ کر ٹمپل روڈ پر سے گزرا۔

اس میں میری ایڈونچر طبیعت اور کچھ نوجوانی کے عاقبت نااندیش جذبات کا بھی دخل تھا۔ نئے نئے جزیرے دریافت کرنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ کبھی میں اپنے آپ کو ابن بطوطہ سمجھا کرتا تھا اور کبھی خود پر کولمبس کا گمان ہوتا جو بحر اوقیانوس کے طوفانی سمندروں میں اپنا بادبانی جہاز لیے نامعلوم سرزمینوں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ یہ احساس کافی ہیجان خیز اور ایڈونچرس تھا اور اسی جذبے نے مجھے بچپن ہی سے سیاحت اور آوارہ گردیوں کی خطرناک شاہراہوں پر ڈال دیا تھا۔

میں ٹرام میں بیٹھا جب اس پراسرار عورت کے مکان کے قریب سے گزرا تو میری نظریں پہلے ہی اس مکان کی طرف مرکوز تھیں۔ میں نے دیکھا' پراسراری دبلی پتلی لڑکی نما عورت گیروے رنگ کی ساڑھی پہنے ہاتھ میں پیتل کی تھالی لیے برآمدے کے ستون کے پاس کھڑی آنگن میں چڑیوں کو چاول ڈال رہی ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس نے بھی عین اس وقت میری طرف دیکھا جب ٹرام مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس بار پھر وہ ذرا سا مسکرائی۔ میں تو حیرت اور اسرار کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ میں نہ مسکرا سکا۔ ٹرام آگے نکل گئی۔ ٹرام بودھ مندر کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ چوک کے اسٹاپ پر ٹرام رکی تو میں غیر ارادی طور پر نیچے اتر آیا۔ کوئی نامعلوم قوت مجھے اس پراسرار عورت کی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں پیدل ہی فٹ پاتھ پر اس عورت کے مکان کی طرف چل پڑا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ کہیں یہ عورت چڑیل نہ ہو۔ کوئی بھوت پریت نہ ہو جس نے انسانی شکل اختیار کر رکھی ہو۔ اس خیال نے میرے شوق کو تیز کر دیا۔ کیونکہ بھوت پریت اور چڑیلوں سے مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ مجھے کسی چڑیل سے خوف بھی کبھی محسوس

نہیں ہوا تھا۔ میں انسانی شکل میں اتنی چڑیلیں اور جن بھوت دیکھ چکا تھا کہ اب کسی اصلی چڑیل یا جن بھوت کا دل میں خوف نہیں رہا تھا بلکہ شوق پیدا ہو گیا تھا کہ کسی اصلی اور غیر ملاوٹی چڑیل سے بھی مل کر دیکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اس پراسرار لڑکی سے ملا تو سب سے پہلے میری نگاہیں اس کے پاؤں پر گئی تھیں کہ کہیں اس کے پاؤں اُلٹے تو نہیں ہیں۔ سنا تھا کہ چڑیلوں کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں مگر اس لڑکی کے پاؤں سیدھے تھے۔

میں پراسرار لڑکی کے مکان کے باہر آ کر رک گیا۔ مجھے کیا کرنا ہو گا یہ میں نے سوچ لیا تھا۔ دروازے پر گیروے رنگ کا پٹ سن کا پردہ لٹک رہا تھا۔ بلانے والی گھنٹی کا بٹن نہیں تھا۔ کسی کے نام کی پلیٹ بھی باہر نہیں لگی تھی۔ میں نے پردے کو ذرا سا اٹھایا۔ لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور وہی سانولی عورت یا لڑکی نما عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ماتھے پر سرخ بندیا تھی۔ مانگ میں سیندور نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بانہوں میں سرخ رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ اگر بیوہ ہوتی تو یہ چوڑیاں نہ پہنے ہوتی۔ لمبے سیاہ بالوں کی مانگ بیچ میں سے نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کا رنگ کیسری تھا۔ کیسری آنکھوں والی عورت کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں مجھے ایک مقناطیسی کشش محسوس ہوئی جو مجھے مسحور کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ میں نے انگریزی میں پوچھا' کیونکہ جنوبی ہند اور برما لنکا میں اجنبی انگریزی میں ہی بات کرتے ہیں۔ ان علاقوں کی آوارہ گردیوں کی وجہ سے میں اس عمر میں بھی گزارے جتنی انگریزی بول لیتا تھا' آج بھی ان علاقوں میں انگریزی کا معیار بہت اونچا ہے اور ریلوے اسٹیشن کے قلی اور رکشا ڈرائیور بھی انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے پراسرار لڑکی سے پوچھا۔

"وجے ناتھم سبرامینم کی باڑی یہی ہے کیا؟"

اتنا مجھے لڑکی کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سنہالی لڑکی نہیں ہے' بلکہ تامل لڑکی ہے۔ سنہالی لڑکیوں کے نقش ذرا بیٹھے بیٹھے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ بھی سبزی مائل سانولا ہوتا ہے۔ مگر اس لڑکی کا رنگ سیاہی مائل چمکیلا گہرا سانولا تھا۔ اس کے کانوں میں زمرد کے بندے تھے۔ اس نے میری طرف مسحور کن نظروں سے دیکھا اور ہندوستانی میں بولی۔

"یہ باڑی سبرامینم کی نہیں ہے۔"

اس دوران میں اس کے پاؤں دیکھ چکا تھا جو الٹے نہیں تھے بلکہ بالکل سیدھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے افسوس بھی ہوا کہ یہ لڑکی چڑیل نہیں تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں جو پراسراریت تھی وہ اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ یہ کوئی نارمل لڑکی بھی نہیں ہے۔ اس کا

تعلق ضرور ہوائی مخلوق سے ہے۔ میں یونہی دوسرے مکان کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے سبرامینم نے یہی مکان بتایا تھا۔"

لڑکی کی کیسری آنکھیں برابر مجھے ٹکٹکی باندھے گھور رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ اس کا مکان نہیں ہے۔"

اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ عجیب بات ہے کہ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر اسی انداز میں مسکرائی جس طرح وہ مجھے ٹرام میں گزرتے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ ایک پل کے لیے میں فٹ پاتھ پر بت بنا کھڑا رہا' پھر چپ چاپ اپنے بوریلا جنکشن والے چوک کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ یہ تو میں لکھ چکا ہوں کہ میں بوریلا جنکشن یعنی بوریلا چوک کے علاقے میں مسز جونز کی کوٹھی آلمس پیلس کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ وہاں پہنچا تو ملک ممتاز صاحب کو لان میں کرسی پر بیٹھے مسز جونز سے باتیں کرتے دیکھ کر میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ یہ میں سن چکا تھا کہ کیپٹن ممتاز ملک ریڈیو سی ایک سیلون کے انچارج ہو کر دلی سے آ رہے ہیں۔ مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ آج پہنچنے والے ہیں۔ ملک صاحب نے مجھے گلے لگایا اور بولے۔

"دیکھو لو رنگون کے بعد اب یہاں بھی ہم مل گئے۔"

رنگون میں ممتاز ملک کیپٹن نہیں تھے' یہ سن ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ جنگ عظیم پورے زوروں پر تھی۔ جاپان اعلان جنگ کر چکا تھا اور ملک ممتاز رنگون کے دو اردو روزناموں یعنی "مجاہد برما" اور "شیر رنگون" کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ یہ دونوں اردو اخبار سید کشفی شاہ صاحب کی ملکیت تھے جو محترم ایس ایم ظفر کے والد بزرگوار تھے۔ اونچے لمبے چوڑے' ہڈ کاٹھ' لمبی داڑھی' نورانی چہرہ' ہاتھ میں عصا لیے اخبار کے دفتر میں اپنی پرانی گاڑی میں سوار ہو کر آتے تھے۔ رنگون میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ یہ دونوں اردو اخبار انہوں نے ہی جاری کیے تھے اور دونوں اخباروں کے چیف ایڈیٹر ظہور شاہ صاحب تھے۔ ملک ممتاز نیوز ایڈیٹر تھے۔ ممتاز ملک صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ ہی رنگون لے گئے تھے۔ میں ان دنوں ناویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ رنگون کی سیاحت کے شوق میں میں نے وقتی طور پر پڑھائی کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ میں اخبار "مجاہد برما" اور "شیر رنگون" میں کام تو نہیں کرتا تھا لیکن ملک صاحب کے ساتھ دفتر میں روزانہ جاتا۔ کبھی کبھی ملک صاحب مجھے کسی خبر کا ترجمہ کرنے کے لیے بھی دے دیتے تھے۔ ملک صاحب ریڈیو رنگون پر بھی خبریں پڑھتے اور اردو میں جنگ کے حالات پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے ریڈیو رنگون پر پنجابی میں تین منٹ کی خبریں پڑھنے کے کام پر بھی لگا دیا تھا۔ رنگون پر جب جاپانیوں نے قبضہ کیا تو ہم سب بڑی مشکل سے جانیں بچا کر پیدل برما کے جنگلوں

سے گزر کر پروم اکیاب اور جانے کون کون سے علاقوں سے ہوتے ہوئے کاکس بازار پہنچے تھے۔ یہ پیدل سفر چالیس دنوں میں ختم ہوا تھا۔ جو لوگ یہ سفر کر چکے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ یہ کس قدر دشوار گزار اور موت کا سفر تھا۔ باری علیگ بھی اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ بہرحال سری لنکا یعنی اس زمانے کے سیلون کے دارالحکومت کولمبو میں کیپٹن ممتاز ملک کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ملک صاحب کو چراغ حسن حسرت' فیض احمد فیض اور سید ضمیر جعفری کے ساتھ ہی کمیشن ملا تھا' کہنے لگے۔

''میں نے مسز جونز کی کوٹھی والی انیکسی کرائے پر لے لی ہے۔ اب میں بھی یہیں رہوں گا۔ تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

پھر جھنگ کی ٹھیٹھ اور میٹھی زبان میں مسز جونز کو ایک خوبصورت سی گالی دے کر بولے۔

''کنجوس اور لالچی عورت ہے اس کو مجھ سے بڑا فائدہ ہو گا۔ میں نے آج صبح ہی اسے نافی (ملٹری سٹور) سے چینی چائے اور پورٹ وائین کے علاوہ سگریٹ لا کر دیئے ہیں۔''

ریڈیو سیلون کے احاطے میں ہی ایک فوجی کینٹین تھی جس کو ''نافی'' کہتے تھے اور جہاں فوجیوں کو ہر قسم کی چیزیں بڑے سستے داموں ملتی تھیں۔ کیپٹن ملک نے آتے ہی مجھے سویلین وی سی او (VCO) بنا دیا تھا۔ مجھے وردی تو نہیں پہننی پڑتی تھی مگر فوجی کینٹین سے تمام چیزیں فوجی راشن پر ملتی تھیں۔ گولڈ فلیک کے سگریٹ ان دنوں ٹین کے گول ڈبوں میں بھی آیا کرتے تھے۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیں کہ گولڈ فلیک کا ایک ٹن ہمیں دس آنے میں ملا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ٹن فروٹ' ٹن فوڈ' چائے' چینی' چاکلیٹ' پورٹ وائین' جرابوں' بنیانوں اور ٹن فوڈ کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ میں نے مختلف قسم کے اعلیٰ سگریٹ ٹرائی کرنے شروع کر دیئے۔ مجھے سینئر سروس سگریٹ بے حد پسند آیا۔ اس کی چوڑی سفید ڈبی ہوا کرتی تھی جس پر نیلے رنگ کا بادبانی جہاز بنا ہوتا تھا۔ یہ انگلش سگریٹ تھا۔ میں اپنے راشن پر اس سگریٹ کا بڑا کارٹون لایا تو مسز جونز میرے آگے پیچھے پھرنے لگی۔ اصل میں وہ بھی اس اعلیٰ سگریٹ کی دیوانی تھی مگر چونکہ سگریٹ بازار میں مہنگے تھے اور مسز جونز کنجوس عورت تھی اس لیے وہ کرسمس کے موقع پر ہی پیتی تھی۔ میرے پاس سینئر سروس سگریٹ کا بڑا ڈبہ دیکھا تو میرے ارد گرد منڈلاتے ہوئے میری بلائیں لینے لگی۔ میں چونکہ مسز جونز کا بڑا احترام کرتا تھا اس لیے اسے چار پیکٹ دے دیئے تو وہ نہال ہو گئی۔ اس روز شام کو مسز جونز نے خاص طور پر مجھے انڈوں کا پراٹھا بنا کر کھلایا گھی میں تر تراتا ہوا پراٹھا میری پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ ہمارے آباء و اجداد ہالینڈ میں آنے سے پہلے پرتگال میں کرسمس کے موقع پر بنایا کرتے تھے۔''

کرشنن نام کا ایک دبلا پتلا تامل نوجوان مسز جونز کا ملازم تھا۔ کیپٹن ملک کے ہاتھ میں پیسہ کبھی نہیں ٹکتا تھا۔ ادھر تنخواہ لیتے اور ادھر اسے لٹا دیتے تھے۔ کرشنن کو بھی ہر ماہ سو پچاس روپے دیتے جو اس زمانے میں بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ کرشنن انناس کاٹنے میں بڑا ماہر تھا۔ ملک صاحب اسے کہتے۔

''کرشنن جاؤ انناس لا کر کھلاؤ۔''

کولمبو میں یہ ۱۹۴۶ء یا ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور اس زمانے میں بھی کولمبو میں ایک انناس دو آنے کا مل جاتا تھا۔ سیلون انگریزوں کے تسلط میں تھا۔ چنانچہ وہاں سکہ ایک روپے کا ہی چلتا تھا مگر ریزگاری میں سینٹ چلتے تھے۔ ۲۵ سینٹ میں ایک صحت مند جوان انناس آسانی سے مل جاتا تھا۔ ملک صاحب کرشنن کو پانچ روپے کا نوٹ دیتے' وہ چھ سات انناس لے آتا اور ملک صاحب نے کبھی کسی سے واپس پیسے نہیں لیے تھے۔ کرشنن کو میں دیکھتا کہ دونوں ہاتھوں میں انناس پکڑے خوش خوش چلا آ رہا ہے۔ کوٹھی کے برآمدے میں بڑا سا تھال رکھ کر وہ بیٹھ جاتا اور لمبے خمدار چھرے سے اس صفائی سے انناس کے چھلکے اتارتا کہ کیا مجال ذرا سا گودا اس کے ساتھ اترے۔ پھر وہ ان کے بڑے خوبصورت گول گول قتلے بنا کر ڈش میں سجا دیتا۔ مسز جونز آتے جاتے میں ایک قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈالتی اور ملک صاحب کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔

''مسٹر ملک! ونڈرفل''

ایک روز مسز جونز کے ہاں کوئی تقریب تھی۔ شام کو اس کے سامنے والے رشتے دار آنے والے تھے۔ مسز جونز نے بڑا دل نکالا اور نوکر کرشنن سے کہا۔ ''آج مرغی بناؤ۔'' کرشنن اگرچہ مسز جونز کی کنجوس طبیعت سے واقف تھا مگر جانے کیا بات ہوگئی کہ وہ یہ سمجھا کہ مسز جونز نے گھر والی مرغی کاٹنے کو کہا ہے۔ چنانچہ اس نے چھری پکڑی اور مرغی کو ڈربے سے نکال کر ابھی چھری چلائی ہی تھی کہ مرغی کی چیخ سن کر مسز جونز دوڑی دوڑی آئی۔ مرغی نیم بسمل تھی۔ ابھی اس کی گردن ذرا سی ہی کٹی تھی' خون بہہ رہا تھا۔ مسز جونز نے کرشنن کی پیٹھ پر زور سے لات مار کر گرایا اور زخمی مرغی کو پکڑ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ وہاں جاتے ہی مرغی کی گردن کے زخم کو ڈیٹول سے دھویا۔ اس پر دوائی لگائی۔ پھر پٹی باندھی اور اس کے حلق میں نیم گرم دودھ ٹپکانے لگی۔ وہ مرغی کو پیار بھی کرتی جاتی تھی اور کرشنن کو گالیاں بھی دے رہی تھی۔ شام کو جب ہم لان میں آئے تو دیکھا کہ زخمی مرغی کی گردن پر بڑی سی پٹی بندھی ہے۔ مسز جونز نے اسے گود میں اٹھا رکھا ہے اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی ہے۔ مسٹر جونز کہہ رہے ہیں۔

''یہ زندہ نہیں رہے گی ایلس' اسے روسٹ کر لے۔''

اور مسز جونز زخمی مرغی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں اسے کل بڑے ہسپتال لے جاؤں گی۔تم اپنی زبان بند رکھو جونز۔۔۔۔۔۔''

اسی رات مرغی نے دم توڑ دیا۔کرشنن کوٹھی سے بھاگ گیا۔مسز جونز رو رہی تھی اور نوکر کرشنن کو گالیاں دے رہی تھی۔رات کو مسز جونز نے مردہ مرغی کی لاش کو اپنے بستر میں سینے سے لگا کر رکھا ہے۔اگلے روز کوٹھی کے عقبی لان میں باقاعدہ قبر بنائی۔اس پر بانس کی صلیب بنا کر لگائی اور گتے پر یہ لکھ کر کتبہ لگا دیا کہ

''یہاں میری پیاری سہیلی دفن ہے۔''

ریڈیو اسٹیشن کی سرگرمیاں

وہ کیسری آنکھوں والی پراسرار لڑکی مجھے پھر اس مکان میں دکھائی نہ دی۔خدا جانے وہ کہیں باہر چلی گئی تھی۔میں اسے دیکھنے تقریباً روز تیسرے پہر اور کبھی صبح کے وقت ٹمپل روڈ پر ٹرام میں گزرتا۔اس کے مکان کا آنگن سونا پڑا ہوتا۔گھر میں کوئی دوسرا آدمی یا عورت بھی کبھی دکھائی نہ دیتی۔ایک دن میں دوبارہ اس کے مکان پر جا پہنچا۔سرخ پردہ ہٹا کر دروازے کو دیکھا۔وہاں تالا لگا تھا۔مجھے یقین ہو گیا کہ پراسرار لڑکی یا تو کولمبو سے کوچ کر گئی ہے یا اپنے کسی رشتے دار کے ہاں دوسرے شہر گئی ہے۔جانے کیوں یہ پراسرار لڑکی مجھے ہانٹ کرنے لگی تھی۔دن میں کئی بار اس کا خیال آتا۔

ریڈیو سیلون پر ان دنوں بڑے دلچسپ لوگ جمع ہو گئے تھے۔کیپٹن ممتاز ملک اپنی جگہ پر ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔انہیں کام کرتے دیکھ کر محسوس ہوتا کہ وہ لوہے کے آدمی ہیں۔انتھک کام کرتے' کبھی نہیں تھکتے تھے۔ہماری اردو یا انڈین سروس میں میرے اور ملک صاحب کے علاوہ لیفٹیننٹ صدیقی' حوالدار پیارے لعل' صوبیدار بوستان خان اور صوبیدار پیارا سنگھ بھی تھے۔صوبیدار بوستان خان جہلم کے رہنے والے تھے۔اونچے لمبے جوان تھے۔عمر پختہ تھی۔بڑے کم گو اور سیدھے سادے آدمی تھے۔اکثر سنجیدہ رہتے۔بہت کم بات کرتے تھے۔کبھی ڈیوٹی سے غیر حاضر نہیں ہوتے تھے۔مشروبات تو دور کی بات ہے سگریٹ تک نہیں پیتے تھے۔جب مسکراتے تو بالکل بچہ معلوم ہوتے تھے۔حوالدار پیارے لعل چالاک اور زیرک تھا مگر کیپٹن ملک کے آگے دب کر رہتا تھا۔صوبیدار پیارا سنگھ ڈیوٹی کے وقت ڈسپلن کا سختی سے خیال رکھتا۔مگر شام ہوتے ہی وہ اپنے گیریژن والی بارک میں چارپائی پر مشروب کی بوتل کھول کر بیٹھ جاتا۔تھوڑی دیر بعد اس کی پگڑی بھی کھل جاتی۔بدقسمتی سے لیفٹیننٹ صدیقی کی چارپائی اسی بارک میں پیارا سنگھ کے بالکل سامنے تھی۔صدیقی صاحب انگریزی تہذیب یافتہ بڑے متین پڑھے لکھے اردو انگریزی ادب کے دلدادہ فلاسفر

ٹائپ آدمی تھے۔ پائپ پیتے تھے اور عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے ان کی ذہین آنکھیں ہر وقت کچھ سوچتی رہتی تھیں۔ میرٹھ کے رہنے والے تھے اور سوائے پائپ کے اور کچھ نہیں پیتے تھے۔ گفتگو بڑی نفیس اور ادبی کیا کرتے تھے۔ دھیمی آواز میں بولتے تھے۔ ان کے قہقہے کی بھی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اب ایسے آدمی کے سامنے صوبیدار پیارا سنگھ کی چارپائی ڈال دینا تو سراسر ظلم تھا۔ صوبیدار پیارا سنگھ کو جب چڑھ جاتی تو وہ اپنی پگڑی گلے میں لٹکائے لیفٹیننٹ صدیقی کی چارپائی پر آ کر بیٹھ جاتا اور اپنی گردن کو ریچھ کی طرح ہلاتے ہوئے ایک ہی جملے کی تکرار شروع کر دیتا۔

''صدیقی صیب! مجھے اردو سناؤ۔ مجھے تمہاری اردو بڑی پسند ہے' مجھے اردو سناؤ۔''

مرنجان مرنج کی جان عذاب میں آ جاتی۔ بے چارہ کبھی آہستہ سے مسکراتا' کبھی بغلیں جھانکتا' اٹھ کر جانے لگتا تو صوبیدار پیارا سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر چارپائی پر دوبارہ بٹھا دیتا۔

''صدیقی صیب! آپ اردو سنائے بغیر یہاں سے ہل نہیں سکتے۔''

اگرچہ عہدے میں پیارا سنگھ اس سے چھوٹا تھا اور اسے صدیقی صاحب کے سامنے بالکل نہیں بولنا چاہیے تھا لیکن پیارا سنگھ بلانوش تھا اور جب اسے چڑھ جاتی تو وہ کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ بارک میں مست ہاتھی کی طرح جھومتا پھرتا۔ بارک میں دوسرے این سی او اس کا بڑا ریکارڈ لگاتے تھے۔ پیارا سنگھ میں یہ بات ضرور تھی کہ سکھ ہونے کے باوجود وہ کسی کو گالی نہیں دیتا تھا۔ اسے چڑھی ہوئی تب بھی گالی اس کی زبان سے نہیں نکلتی تھی۔ بس اپنی بیوی کو یاد کر کے اونچی آواز میں ماہیا گانے لگتا یا اپنے ایک ایک ساتھی کی چارپائی پر جا کر سکھوں کے لطیفے سنا کر خود ہی اپنا مذاق اڑاتا اور یا پھر موڈ میں آ جاتا تو صدیقی صاحب کی چارپائی پر بیٹھ کر شروع ہو جاتا کہ صدیقی صیب! مجھے اردو بول کر سناؤ' میں اردو کا عاشق ہوں' میں اردو کا رانجھا جوگی ہوں' اردو میری ہیر ہے۔''

صدیقی صاحب نے ملک صاحب سے شکایت کی اور کہا کہ صوبیدار پیارا سنگھ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ٹھیک ہے میں اردو بولتا ضرور ہوں مگر میں کسی کو خاص طور پر اردو سنا نہیں سکتا مجھے کسی اور جگہ منتقل کر دیجئے۔ ملک صاحب نے صوبیدار پیارا سنگھ کو دفتر میں اٹن شن کروا کر خوب ڈانٹا۔ پیارا سنگھ سر جھکائے خاموشی سے بالکل بچوں کی طرح اپنے کیپٹن کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا۔ پھر وعدہ کیا کہ وہ اب لیفٹیننٹ صدیقی سے اردو سننے کی فرمائش نہیں کرے گا۔ سیلوٹ مارا اور ڈبوں میں سے فرمائشی پروگرام کے ریکارڈ نکالنے لگا۔ ریڈیو سیلون سے برٹش فورسز کے لیے اردو' نیپالی' گورکھالی' تامل' تلگو' پنجابی اور پشتو کے ریکارڈ بجا کرتے تھے۔ میں دس منٹ کی گیتوں بھری کہانی لکھتا تھا۔ ایک ہفتہ امن سے گزر گیا۔ صوبیدار پیارا سنگھ رات کو اپنی چارپائی پر بیٹھ کر اپنے شغل میں لگ جاتا۔

جب اس کی پگڑی کھل جاتی تو وہ اٹھ کر بارک میں اپنے دوسرے این سی او ساتھیوں کے پاس چلا جاتا۔صدیقی صاحب کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر تھوڑی دیر کھڑے کھڑے آگے پیچھے جھومتا۔صدیقی صاحب کو اپنی لال لال آنکھوں سے گھورے جاتا۔پھر ڈولتے ہوئے سلیوٹ مار کر کہتا۔

''سر! اردو نہیں سنوں گا۔''

اور ڈولتا ڈولتا اپنے بارک کے ساتھیوں کے پاس چلا جاتا۔مگر ایک دن صوبیدار پیارا سنگھ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔چارپائی پر بیٹھ کر اپنے شغل میں مصروف ہو گیا۔اس روز پیارا سنگھ کو تنخواہ ملی تھی۔اسے زیادہ چڑھ گئی تھی۔پگڑی گلے میں ڈال کر بھڑک مار کر اٹھا اور صدیقی صاحب کی چارپائی پر چھلانگ لگا دی۔صدیقی صاحب ڈر کر بھاگنے لگے مگر پیارا سنگھ نے انہیں دبوچ لیا اور دھاڑا۔

''سناؤ اوئے اردو مینوں۔۔۔۔۔۔۔کداں نہیں سنائیں گا تو اردو مینوں''

دوسرے دن کیپٹن ممتاز ملک نے صوبیدار پیارا سنگھ کا کورٹ مارشل کر دیا۔اسے جرمانہ ہو گیا اور صدیقی صاحب کی چارپائی بارک میں دوسری جگہ منتقل کر دی۔ایک رات ملک صاحب گھر کے لان میں بیٹھے مسز جونز اور ان کے رشتے داروں سے باتیں کر رہے تھے۔رات کے دس بج چکے تھے۔میں بھی وہیں باغ میں بیٹھا تھا کہ فوجی جیپ کوٹھی کے باہر آ کر رکی۔اس میں انگلش سیکشن کا لیفٹیننٹ کور بیٹھا تھا۔اس نے آ کر ملک صاحب کو سلیوٹ کیا اور کہا کہ صوبیدار پیارا سنگھ بملا پٹی تھانے کی حوالات میں بند ہے۔ملک صاحب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔پتہ چلا کہ صوبیدار پیارا سنگھ کی رات کو اپنی چارپائی پر بیٹھے اپنا شغل کرتے ہوئے جب پگڑی کھل گئی تو اس نے وردی پہنی اور کولمبو کی سڑکوں پر نکل آیا۔یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے کوئی مست ہاتھی سڑک پر نکل آئے۔بملا پٹی کا علاقہ پاس ہی تھا۔صوبیدار پیارا سنگھ نے ٹیکسی پکڑی اور چوک میں جا کر ڈرائیور کو ایک سو روپیہ نکال کر دیا اور بولا۔''لے جاؤ عیش کرو یہ تمہارا کرایہ ہے۔''

ڈرائیور بے چارہ منحنی سا سنہالی تھا' ڈر گیا کہ اگر اس نے سو روپیہ لے لیا تو کہیں یہ مست ہاتھی جو فوجی وردی میں ہے اسے پکڑ کر نہ لے جائے۔اس نے انکار کیا تو پیارا سنگھ نے چاقو نکال لیا۔چوک میں شور مچ گیا۔ٹیکسی والا تو موقع پا کر بھاگ گیا۔اب پیارا سنگھ تھا اور بملا پٹی چوک تھا۔وہ چاقو لہرا رہا تھا اور ہر آتے جاتے پر وار کرنے کی کوشش کرتا جو کوئی اسے پکڑنے کو آتا اس پر بھڑک مار کر لپکتا۔پولیس کی پوری گارڈ آ گئی۔ناٹے قد کی سنہالی پولیس والے بونوں کی طرح اس اونچے لمبے کھلے بالوں والے پیارا سنگھ کے آگے پیچھے دوڑنے لگے۔بڑی مشکل سے خدا جانے کس طرح پولیس والے اس مست ہاتھی کو قابو کر کے تھانے لائے اور حوالات میں بند کر دیا۔

اس کے بعد رجمنٹ کے گیریژن میں فون کیا۔ وہاں لیفٹیننٹ کو پر نے جیپ پکڑی اور سیدھا کیپٹن ملک کے پاس آ گیا۔ کیونکہ ملک صاحب ہی گیریژن کمانڈر تھے۔ ملک صاحب نے اسی وقت وردی پہنی ۔ مجھے جیپ میں ساتھ بٹھایا اور سیدھا بملا پٹی کے تھانے آ گئے ۔ تھانے میں ہاہا کار مچی تھی ۔ پیارا سنگھ حوالات میں بدمست گوریلے کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ اس کے بال کھلے تھے۔ پگڑی کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں رہ گئی تھی ۔ فوجی بش شرٹ کے سارے بٹن کھلے تھے۔ صوبیدار پیارا سنگھ سنہالی پولیس کو گالیاں دے رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے حوالات کی سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ملک صاحب نے جاتے ہی گرجدار آواز میں کہا۔

''صوبیدار پیارا سنگھ۔۔۔۔۔۔اٹن شن!''

مجھے ڈر تھا کہ سب کے سامنے پیارا سنگھ ملک صاحب کو بھی نہ الٹی سیدھی سنا دے ۔ وہ واقعی اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ ملک صاحب کی آواز سنتے ہی پیارا سنگھ جو ایک بدمست ہاتھی کا بن چکا تھا' ایک دم سے اٹن شن ہو گیا۔ کیپٹن ملک نے اسے بہت زیادہ ڈانٹا۔ اس کے خلاف تھانے والوں نے پرچہ کاٹ رکھا تھا مگر ملک صاحب نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ صوبیدار پیارا سنگھ کو بڑی مشکل سے جیپ میں لا کر اسے گیریژن پہنچایا اور واپسی پر مجھے کہنے لگے۔ ''میں صبح ہوتے ہی اس کا کورٹ مارشل کر دوں گا۔''

مگر صبح کو ملک صاحب بھی بھول چکے تھے کہ رات کو کیا ہوا اور صوبیدار پیارا سنگھ کو تو خیر کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ یہ سکھ صوبیدار بھی ایک طرفہ تماشا تھا۔ دفتر میں بھیگی بلی بنا رہتا' دفتر کے سارے کام انتہائی ذمے داری سے ادا کرتا۔ ایک روز میں ریڈیو کے بوتھ میں اناؤنسمنٹ کر رہا تھا کہ اسٹوڈیو کی گھڑی رک گئی ۔ وہاں ریڈیو اسٹیشن کے ہر بوتھ اور اسٹوڈیوز میں ٹیلیفون لگے ہوئے تھے جن کی گھنٹی نہیں بجتی تھی بلکہ سرخ بتی روشن ہو جاتی تھی ۔ میں نے اسی وقت اوپر آفس میں فون کیا کہ اسٹوڈیو کی گھڑی خراب ہو گئی ہے۔ فون صوبیدار پیارا سنگھ نے اٹھایا تھا' کہنے لگا۔

''سر! میں ابھی گھڑی لاتا ہوں۔''

دوسرے منٹ ٹھکا ٹھک کرتا صوبیدار پیارا سنگھ بوتھ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے آفس میں جو دیوار پر کلاک لگا رہتا تھا وہ کاندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ کلاک میرے سامنے دیوار کے ساتھ لگا کر فرش پر کھڑا کر دیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے سر' کوئی اور حکم؟''

انڈین سروس اور انگلش سروس کے دفتر دوسری منزل میں ساتھ ساتھ تھے۔ اسٹوڈیوز پہلی منزل میں تھے۔ یہ ریڈیو اسٹیشن ایک

بہت بڑی کوٹھی لے کر بنایا گیا تھا۔ یہ فوجی ریڈیو اسٹیشن تھا جبکہ سیلون گورنمنٹ کا اپنا ریڈیو اسٹیشن الگ تھا جہاں سے سنہالی میں پروگرام ہوتے تھے۔ ہمارے ریڈیو اسٹیشن کے گیٹ کے اندر آئیں تو بائیں ہاتھ کو ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ٹرانسپورٹ انچارج مسٹر کانگری بیٹھتا تھا۔ مسٹر کانگری سنہالی تھا اور ہم اسے مسٹر کانگرو کہا کرتے تھے۔ ہمیں فوجی جیپ یا مائیکرو ویگن کی ضرورت ہوتی تو ہم دفتر سے فون کر دیتے۔

''ہیلو مسٹر کانگرو' کوئی گاڑی مل جائے گی اس وقت؟''

کانگرو کہنے پر مسٹر کانگری کبھی ناراض نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ ایک بار کوئی فوجی گاڑی ریڈیو اسٹیشن کے گیٹ سے ذرا سی ٹکرا گئی۔ گیٹ کی آدھی دیوار ڈھے گئی۔ کیپٹن ملک نے فوراً مرمت کے آرڈر دے دیئے۔ مسٹر کانگرو نے ٹنڈر طلب کر لیے۔ پھر ایک روز دو کالے کالے منحنی سے سنہالی راج دیوار کی مرمت کرنے آ گئے۔ کیپٹن ملک نے مجھے کہا۔

''یہ کانگرو کم بخت سنہالی مستریوں کو لے آیا ہے۔ اب تم دیکھنا کہ یہ کیا کرتے ہیں۔''

دیوار کی صرف اینٹیں ہی جوڑنا تھیں مگر سنہالی راج نے آدھا دن لگا کر دیوار کا چاروں طرف سے جائزہ لیا۔ ہم اوپر کھڑکی میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ سنہالی راج پہلے ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی دیوار کو دیکھتا۔ پھر سامنے بیٹھ کر مزے سے ایک بیڑی پیتا۔ دوسری طرف سے دیوار کا جائزہ لیتا۔ پھر دوسری طرف سامنے بیٹھ کر ایک بیڑی پیتا اور پھر جہاں اینٹیں لگانی تھیں اس جگہ کا غور سے جائزہ لیتا اور وہیں بیٹھ کر بیڑی کے کش لگانے لگتا۔ ملک صاحب نے کہا۔''تم آگے آگے دیکھنا یہ کیا کرتا ہے۔''

دوسرے دن سنہالی راج نے دفتر کے گیٹ کے بالکل سامنے سڑک کے پار درختوں تلے ایک چھوٹی سی جھگی بنانی شروع کر دی۔ ایک دن لگا کر اس نے جھگی بنائی۔ معلوم ہوا کہ یہ اس لیے ہے کہ اگر کام کرتے کرتے بارش شروع ہو گئی تو وہ جھگی میں پناہ لے سکے گا۔ اب اس نے کام شروع کر دیا۔ سوتر باندھا۔ گارا تیار کروایا۔ پھر کہیں ایک گھنٹے بعد جا کر اس نے دیوار کی چنائی شروع کر دی۔ دس پندرہ اینٹیں لگائی تھیں کہ انگڑائی لے کر اٹھا۔ مزدور کو ساتھ لیا اور اپنی جھگی میں جا کر کیتلی کے نیچے آگ جلا کر چائے بنانی شروع کر دی۔ یوں جو کام ہمارے ہاں آدھے دن میں ہو جاتا ہے اسے اس سنہالی راج نے پورے ایک ہفتے میں مکمل کیا۔ حالانکہ وہ ٹھیکے پر کام کر رہا تھا' دیہاڑی پر نہیں۔ ملک صاحب کہنے لگے۔

''سنہالی لوگوں کی اس سہل انگاری نے باہر سے تامل لوگوں کو یہاں آ کر آباد ہونے کی دعوت دی ہے۔ یہ لوگ اس قدر سست اور تساہل پسند ہیں کہ دھان تو خود کسی نہ کسی طرح بو لیتے ہیں مگر کٹائی انڈیا سے تامل مزدور آ کر کرتے ہیں۔''

ملک صاحب کی اس بات کا ثبوت کولمبو میں مجھے یوں بھی ملا کہ میں نے دیکھا کہ کولمبو کی ساری اجناس کی منڈیوں پر تامل لوگوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ سخت محنت کا کام تامل لوگ ہی کرتے تھے اور شمال کی طرف کو تامل لوگ صدیوں سے آباد تھے۔ سارا کاروبار انہی کے ہاتھ میں تھا۔ کولمبو شہر میں پٹیہ کا علاقہ اجناس کی منڈی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں' اس منڈی پر تامل لوگوں کا قبضہ تھا' ان میں تامل مسلمان بھی تھے' سواتی میمن بھی تھے مگر آڑھت کسی ایک سنہالی کے پاس بھی نہیں تھی۔ یہ لوگ یوں چھوٹی موٹی مزدوری ہی کرتے تھے اور رات کو تاڑی پی کر وہیں ناچتے گاتے نیم بے ہوش ہو کر پڑے رہتے تھے۔ جبکہ تامل لوگ سخت محنت کرتے تھے۔ فیکٹریوں میں راتوں کی ڈیوٹی دیتے تھے۔ وقت پر آتے اور وقت پر جاتے تھے۔

برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا کہ کیپٹن ملک نے مجھے خود جافنا جا کر ہندوستانی اور بنگالی فلموں کے ریکارڈ لانے کو کہا۔ جافنا چونکہ انڈیا کی نکون کے پاس تھا اس لیے وہاں انڈین اور بنگلہ فلموں کے ریکارڈ بہت جلد پہنچ جاتے تھے۔ دلی ہیڈ کوارٹر کافی دیر لگا دیتا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں کولمبو کے فورٹ اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا اور جافنا کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ وہی جافنا تھا جو آج کل بھی تامل علیحدگی پسند جماعت ایلم کی سرگرمیوں کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ اگرچہ بھارتی فوجیں انہیں دبانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں اس کے باوجود یہ علاقہ زیر زمین تامل علیحدگی پسندوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ ٹرین جافنا کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ کولمبو سے جافنا شمال میں کافی دور تھا۔ میں اپنے ڈبے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا کولمبو کے مضافات کے ناریل کے درختوں کو بارش میں بھیگتے اور پیچھے جاتے دیکھ رہا تھا۔

کولمبو سے جافنا

کولمبو سے جافنا تک کا سفر بہت طویل ہے۔

جافنا' سری لنکا کے شمال میں بالکل اوپر جا کر ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔ اس کے جنوب میں بہت بڑی کھاڑی ہے۔ خلیج پاک کا سمندر مغربی چٹانوں اور چھوٹے چھوٹے پتھریلے جزیروں کے درمیان ایک تنگ راستے سے ہو کر اس کھاڑی میں آ گیا ہے اور یہاں ایک بہت وسیع و عریض جھیل کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ کھاڑی کے تنگ دہانے کے بائیں جانب کر دو تو انام کے چھ سات چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ جافنا کا شہر اور بندرگاہ شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ اوپر شمال مشرق کی طرف پیڈرو نام کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے۔ کولمبو سے گاڑی چلی تو چھوٹے چھوٹے ان گنت اسٹیشن چھوڑتی پولگاہ ویلا کے بڑے جنکشن پر جا کر رکی۔ یہ سری لنکا کے شمال مغربی صوبے کا بہت اہم شہر ہے۔ سارا دن ٹرین کا سفر جاری رہا۔

رات کو ٹرین سری لنکا کے شمالی وسطی صوبے کے عظیم الشان شہر انورادھا پورہ پہنچی۔ راتوں رات دیوینا' پونا کلم اور پورا تھے کے شہر

بھی گزر گئے۔ تقریباً سارا راستہ بارش ہوتی رہی۔ بارش بھی میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔ دن کے وقت تو یہ بارش دکھائی دیتی تھی۔ بارش کو دیکھنا اور پھر جنگلوں میں گرتی بارش کو دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی رہی ہے۔ اس مسرت کا احساس کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا گزر موسلا دھار بارش میں گھنے جنگلوں سے ہوا ہے۔ شہروں کی بارش اور جنگلوں کی بارش میں بڑا فرق ہے۔ اور پھر جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں میں بارش بہت تند خو موسلا دھار اور شدید ہوتی ہے۔ شہروں میں موسم برسات میں بھی بادل گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ برس کر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن جنوب مشرقی ایشیا کی بارشیں کئی کئی روز جاری رہتی ہیں۔ بیچ میں کسی وقت تھوڑی دیر کے لیے رکتی ہے۔ آسمان بادلوں میں مہینہ مہینہ بھر چھپا رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بارش کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ جنگلوں میں بارش کی کئی آوازیں ہوتی ہیں۔ وہ ہر موڑ ہر لمحے میں انسان سے بات کرتی ہے۔ کبھی سرگوشی کرتی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی اس پر جذباتی ہیجان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی دور سے آوازیں دے کر بلاتی محسوس ہوتی ہے اور کبھی اپنی ہولناک گھن گرج سے جھونپڑیوں میں سوئی ہوئی جنگلی لڑکیوں کو ڈراتی ہے اور بچے سمٹ کر اپنی ماؤں کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ پہاڑی ندی نالے تیز رفتار بارش کے پانی سے دھڑ دھڑاتے ہیں۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ کر شور مچاتے گرتے ہیں۔ دریا اپنے کناروں سے اچھل کر باہر آ جاتے ہیں۔ کھیت پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ ساگوان اور دیودار کے درخت اس بارش میں ایک لطیف اور ٹھنڈی خوشبو دینے لگتے ہیں۔ اس خوشبو میں دار چینی کی مہک ہوتی ہے۔ میں بارش کے بھیگتے جنگلوں میں ان درختوں کے ہاتھ ملا کر گزرا ہوں۔ ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی گھنی شاخوں میں سے پانی کی موٹی موٹی بوندیں مسلسل گر رہی ہوتی ہیں۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک جاتے ہیں اور جب بجلی چمکتی ہے اور بادل زور زور سے گرجتے ہیں تو وہ اپنے پروں کو اور زیادہ سمیٹ لیتے ہیں۔ شیر چٹانی کچھاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہاتھی بانس کی گپھاؤں میں چھپ جاتے ہیں اور بلندیوں سے گرتی ہوئی برساتی آبشاروں کا شور بارش کے شور میں گھل مل جاتا ہے۔ سارے جنگل میں درختوں' جھاڑیوں' وادیوں' نشیب کے باغات اور ترائیوں میں بارش کی دھند پھیل جاتی ہے۔

کیلے کے درختوں میں لٹکتے زرد گچھے بارش میں دھل کر شفاف ہونے لگتے ہیں۔ دار چینی' الائچی اور کالی مرچ کے باغوں سے لطیف' پاکیزہ اور روح کو لطیف تر کرنے والی ملی جلی خوشبوؤں کے ٹھنڈے جھونکے آنے لگتے ہیں۔ اس بارش میں میرا کئی بار جی چاہا کہ کسی چٹان کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بازو پھیلاؤں اور بارش کے گرتے موتیوں کی جھالروں میں اڑتا' بادلوں میں گم ہو جاؤں۔ سری لنکا کے جزیرے کی یہی وہ بارشیں تھیں جن کے سریلے آہنگ میں میں ٹرین میں بیٹھا جافنا کی طرف جا رہا تھا۔ ساری رات بارش ہوتی

رہی۔ جنگل' وادیاں اور گھاٹیاں اسی موسلا دھار بارش میں بھیگتی رہیں اور میں اپنے کمپارٹمنٹ کی بند کھڑکی کے شیشے سے لگا اندھیرے جنگلوں میں گرتی بارش کے موتیوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جہاں کسی بھیگے ہوئے اسٹیشن پر رکتی تو بارش کی آواز صاف سنائی دینے لگتی۔ میں شیشہ چڑھا کر اسٹیشن کی روشنی میں بارش میں بھیگتے پلیٹ فارم کو دیکھتا اور میرا دل چاہتا کہ اس پلیٹ فارم پر اتر کر کسی جنگل کی طرف نکل جاؤں۔ جنگل ہماری تہذیب کے اولیں گہوارے ہیں۔ ہم سمندر سے نکل کر سب سے پہلے جنگل میں ہی آئے تھے اور انہی جنگلوں میں سے کسی جنگل میں ہم نے سب سے پہلے آگ جلانے کا حیرت انگیز تجربہ کیا تھا۔ ہمارے جنگلی آباء واجداد کے بھی ہم پر بڑے احساسات ہیں۔ قدرت جنگل میں ہمارے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکتی تھی۔ پھر ہم نے شہر آباد کئے اور ہماری روح جنگلوں کے نیچرل خوشبوؤں سے دور ہوتی چلی گئی۔ شہروں میں برسنے والی بارش جنگلوں کی سفیر ہے۔ وہ جنگلی گلابوں کی خوشبوؤں کے آنچل اوڑھ کر ہمیں اپنے پاس بلانے آتی ہے مگر ہم شہروں کے کیچڑ میں پھنس گئے ہیں۔ اب ہمیں بارش کے ساتھ جنگلی گلابوں کا نہیں بلکہ کیچڑ کا تصور آتا ہے۔

ٹرین بارش میں بھیگتی تاریک جنگلی رات میں اڑی چلی جارہی تھی۔ دن کی روشنی ہوئی تو میں نے کھڑکی کے باہر نشیب میں ہری بھری وادیاں دیکھیں جو بارش میں نکھر گئی تھی۔ بارش اب بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بانس' سال' دیودار اور مہاگنی کے تناور درختوں کے جھنڈ سرسبز ٹیلوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن کو چھوڑتی' دھڑ دھڑاتی گزر گئی۔ اس پلیٹ فارم کی مٹی سرخ تھی اور سامنے جنگلے کے پیچھے کیلے کے درخت بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ٹالی منار کی بندرگاہ مشرق میں ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ تیسرے پہر ٹرین جافنا سے ساٹھ ستر میل پیچھے ایلی فنا پاس کے اسٹیشن پر رکی۔ یہاں تک ہم سمندر کے اوپر بنا ہوا ایک پل عبور کر کے آئے تھے۔ یہ سمندر جافنا کی کھاڑی کا تھا اور یہاں چٹانوں پر پل بنایا گیا تھا۔ شام کے چھ بجے ٹرین جافنا کے بندرگاہی ریلوے اسٹیشن پر جا کر ٹھہر گئی۔

میں نے اسٹیشن کے پاس ہی ایک معمولی سے ہوٹل میں کمرہ لیا اور اپنا اٹیچی کیس رکھ کر غسل کیا۔ دوسرے کپڑے پہنے اور کمرے میں ہی چائے منگوالی۔ سیلون کی چائے لنکا کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں سے لے کر معمولی چائے خانوں تک اپنی اعلیٰ کوالٹی میں ملتی ہے۔ شام کا اندھیرا بارش میں بھیگی ہوئے مرطوب فضاؤں میں گھل رہا تھا۔ جافنا کے بازاروں میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ گیلی سڑکوں پر ان روشنیوں کے عکس بڑے خوبصورت لگتے تھے۔ میں ہوٹل کی دوسری منزل میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ سڑک پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ابھی زیادہ رش کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ سنہالی عورتیں بوندا باندی میں چھتریاں لگائے گزر رہی تھیں۔ کبھی کوئی

بیل گاڑی بھی سامان لادے گزر جاتی۔ سڑک کے پاس اونچی عمارتوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ دو بودھ بھکشو زرد لباس پہنے تاڑ کی ٹہنی کی چھتریاں لگائے کھڑکی کے نیچے سے گزر گئے۔ ہوٹل میں نیچے ریکارڈنگ شروع ہو گئی۔ پہلے سنہالی اور تامل ریکارڈ بجتے رہے۔ پھر فلم ''رتن'' کا گانا لگا دیا گیا۔

ساون کے بادلو ان سے یہ جا کہو

تقدیر میں یہی تھا' ساجن میرے نہ رو

فلم رتن اس زمانے میں کولمبو کے ایک سینما گھر میں شاید پچھترویں ہفتے میں چل رہی تھی۔ اس فلم کے گانے گلی گلی بجتے تھے۔ جافنا میں زیادہ آبادی تامل باشندوں کی تھی۔ بھارت کا تکوئی ساحل یہاں سے دور نہیں تھا۔ روزگار کی تلاش میں آئے ہوئے تامل لوگ لنکا کے شمالی علاقے میں آ کر صدیوں سے آباد ہو گئے تھے۔ یہاں ان کے ہوٹل بھی تھے۔ چائے کے باغات بھی تھے۔ کھیت بھی تھے۔ وہ چائے کے باغات کے مالک بھی تھے اور ان باغوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ مزدوری بھی کرتے تھے۔ پورٹ پیڈ رو اور مغربی ساحل کے چھوٹے چھوٹے جزیرہ نما ناہوؤں میں وہ ماہی گیری بھی کرتے تھے۔ جافنا سے آدمی سٹیمر میں بیٹھ کر ڈیڑھ ایک گھنٹے میں بھارت کی قدیم مندروں والی بندرگاہ رامیشورم پہنچ جاتا ہے۔ بیچ میں خلیج پاک کا سمندر حائل ہے۔ بھارت نے اسی سمندر میں سے اپنے فوجیوں سے بھرے ہوئے جہاز گزارے تھے۔ آج بھی بھارت کا اس خلیج پر قبضہ ہے۔

سری لنکا کے مشرقی ساحل کے شمال میں جافنا سے نیچے آئیں تو سب سے پہلے مولاتی دیو کی بندرگاہ آتی ہے۔ اس کے نیچے ٹرنکومالی اور پھر باتی کلووا کی بندرگاہ ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں سری لنکا کی مسلمان آبادی رہتی ہے۔ ان مسلمانوں کا تعلق زیادہ تر ان عرب تاجروں کے خاندانوں سے ہے جو قدیم زمانے میں تجارتی مال لے کر بادبانی جہازوں میں یہاں سے گزر کر نیچے جنوب مشرق میں سماٹرا' انڈونیشیا اور بورنیو کی طرف جاتے تھے اور وہاں سے تجارتی مال لاد کر ان ہی بندرگاہوں سے ہوتے واپس اپنے وطن کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔ سری لنکا کے ان مشرقی شہروں میں ان کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ سینکڑوں عرب خاندان یہاں آباد ہو گئے تھے۔ ٹرنکومالی اور باتی کلووا میں یہ مسلمان اسلام کی عظیم الشان روایات کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں خوبصورت مسجدیں ہیں جہاں سنہالی مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے گھر اسلامی تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ان کی خواتین سروں کو ڈھانپ کر اور اپنے جسم کے گرد چادر لپیٹ کر گھروں سے نکلتی ہیں۔ آج یہی مسلمان بھارت کی شہہ پر تامل ایلم تنظیم اور خود بھارتی فوجیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی تہذیب' ان کا رہن سہن تامل اور سنہالیوں سے بالکل الگ ہے۔ وہ مشرق میں

جہاں ان کی اکثریت ہے اپنے لیے ایک خطہ زمین کا مطالبہ کر رہے ہیں جہاں وہ اسلامی روایات کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں اور یوں وہ چومکھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ کیمونسٹ ان کا ساتھ نہیں دے رہے۔ تاملوں کو ان پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ ان کے دشمن بن گئے ہیں اور سری لنکا کی حکومت انہیں علیحدہ وطن دینے پر تیار نہیں ہے۔ اب ایک اور مصیبت ان کے سروں پر سوار کر دی گئی ہے اور یہ بھارتی فوج ہے جس کی اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ ہندو جو مسلمانوں کا ازلی دشمن ہے یہاں بھی لنکا کے مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ تلاشی کے بہانے سنہالی مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ اگر وہ احتجاج کرتے ہیں تو انہیں گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ٹرنکومالی اور باقی مکووا کے مسلمانوں میں علیحدہ وطن کا شعور بیدار تھا اور وہ لنکا میں رہتے ہوئے ایک الگ اسلامی صوبے کے حق میں تھے۔

دوسرے دن میں ریڈیو سیلون کے لیے گراموفون ریکارڈ خریدنے جافنا کے مین بازار میں چلا آیا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ بازار کشادہ تھا۔ دونوں جانب ڈھلوان سرخ چھتوں والی دکانیں تھیں۔ کہیں کہیں دومنزلہ مکان بھی تھے جن کے درمیان ناریل کے درخت سر اٹھائے مرطوب ہوا میں جھوم رہے تھے۔ اس بازار میں چائے خانے بھی تھے اور منیاری اور کپڑے کی دکانیں بھی تھیں۔ چائے خانوں کے آگے زرد سیلونی کیلوں کے گچھے اور اناس لٹک رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے احمد پراتھا گراموفون ہاؤس کا انگریزی میں لکھا ہوا بورڈ نظر آیا۔ یہ کسی سنہالی مسلمان کی دکان تھی۔ میں دکان کے اندر آ گیا۔ چھوٹی سی دکان تھی۔ دیوار کے ساتھ گراموفون ریکارڈوں کے ڈبوں کے شیلف لگے تھے۔ کاؤنٹر پر کونے میں ہز ماسٹرز وائس کا گراموفون رکھا تھا۔ ایک دبلا پتلا عمر کا آدمی کاؤنٹر کے پیچھے گراموفون کے قریب کرسی پر بیٹھا سنہالی اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے اخبار الگ رکھ دیا۔ اس آدمی کی چھوٹی سی کالی داڑھی تھی اور سر پر اس نے یمن کے ماہی گیروں والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ دکان میں اگربتی سلگ رہی تھی۔ میں نے جاتے ہی السلام علیکم کہا تو اس آدمی کے چہرے پر ایک دل نشیں مسکراہٹ آ گئی۔ بڑی محبت سے اس نے میرے سلام کا جواب دیا اور اردو میں بولا۔

”کیا تم مسلمان ہو بیٹا؟“

میں نے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہوں، پنجاب کا رہنے والا ہوں اور کولمبو کے ریڈیو سیلون پر ملازم ہوں اور ریڈیو اسٹیشن کے اردو سیکشن کے لیے اردو، پنجابی اور پشتو ریکارڈ لینے آیا ہوں کیونکہ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ جافنا سے دلی سے ایسے ریکارڈ بہت پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ دکاندار نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میرا نام احمد پراتھا ہے۔الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔میرے آباءواجداد صدیوں سے لنکا میں آباد ہیں مگر ہم اصل میں یمن کے رہنے والے ہیں۔آج سے سینکڑوں برس پہلے میرے آباءواجداد تجارت کی غرض سے یہاں آئے اور آباد ہو گئے تھے۔''

وہ بڑی صاف اردو بول رہا تھا۔اس نے بتایا کہ وہ دلی میں کافی عرصہ رہا ہے۔احمد پراتھا تامل اور سنہالی زبان بھی روانی سے بول لیتا تھا۔میری دی ہوئی مطلوبہ ریکارڈوں کی لسٹ کو اس نے غور سے پڑھا۔لسٹ ایک طرف رکھ کر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ اس کے بیٹے کا نام عبدل تھا۔پورا نام عبدالوقیع پراتھا تھا مگر وہ اسے عبدل کے نام سے پکارتا تھا۔عبدل بھی باپ کی طرح دبلا پتلا اور گہری سانولی رنگت والا تھا۔عمر سولہ سترہ برس ہوگی۔عبدل نے فوراً ڈبوں میں سے لسٹ کے مطابق کچھ ریکارڈ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔احمد پراتھا نے میرے لیے چائے اور مٹھائی منگوالی۔میں نے اسے بہت کہا کہ میں ہوٹل سے چائے پی کر آرہا ہوں مگر وہ نہ مانا' کہنے لگا۔

''آپ ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں؟ میرے غریب خانے پر آجایئے۔میرا مکان یہاں سے قریب ہی ہے۔''

میں نے کہا کہ اب تو ہوٹل میں کمرہ لے چکا ہوں۔احمد پراتھا کے پاس کچھ پنجابی ریکارڈ نہیں تھے۔کہنے لگا۔''یہ ریکارڈ میں آپ کو منگوا کر دے سکتا ہوں۔مگر مجھے پورٹ پیڈرو آدمی بھیجنا ہوگا۔آپ کب تک جافنا میں ہیں؟''

میں نے کہا۔''اگر آپ دو ایک دن میں مجھے یہ ریکارڈ منگوا کر دے سکتے ہیں تو میں ٹھہر جاؤں گا۔''

احمد پراتھا بولا۔''دو دنوں میں ریکارڈ پہنچ جائیں گے۔آپ فکر نہ کریں۔لیکن آج دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گے۔''

میں نے ایک بار پھر انکار کیا مگر وہ مصر رہا۔دوپہر کو میں دوبارہ احمد پراتھا کی دکان میں پہنچ گیا۔اس نے خاص طور پر بریانی گھر سے بنوا کر منگوائی تھی جو بے حد لذیذ تھی۔میں نے اپنے جنوبی ہند کے سفر کے دوران بھی یہ بات خاص طور پر دیکھی تھی کہ ان علاقوں میں بریانی عام بنائی جاتی تھی۔یہ یمن اور بصرہ کے ان عرب تاجروں کا اثر تھا جو قدیم زمانے میں یہاں تجارت کی غرض سے آیا کرتے تھے اور بعض یہیں آباد ہو گئے تھے۔جنوبی ہند کے ویران اسٹیشنوں پر بھی یہ بریانی کیلے کے پتوں میں لپٹی مل جاتی تھی۔اور اسے پارسل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔رات کو احمد پراتھا مجھے اپنے گھر لے گیا۔جافنا شہر کے شمال مشرق میں ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے اس کا تین کمروں والا کشادہ گھر تھا جو زمین سے چار فٹ اونچی مچان پر بنا ہوا تھا۔اس مکان کی دیواریں بانس کو جوڑ کر بنائی

گئی تھیں۔ دروازے اور فرش پر لکڑی کے تھے۔ فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں۔ احمد پراتھا کی عمر پینتیس سال کے قریب ہو گی۔ اس کی بیوی بھی سنہالی مسلمان تھی۔ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔ انتہائی خدمت گزار خاموش طبع اور صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھی۔ رات کا کھانا بھی میں نے احمد پراتھا کے گھر پر ہی کھایا۔ چائے پینے کے بعد میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔ میں تین دن جافنا میں رہا۔ احمد پراتھا کی دکان پر اس سے باتیں کرتے گزر جاتا۔ دو دن بعد اس کا آدمی پورٹ پیڈرو سے مطلوبہ ریکارڈ لے کر آ گیا۔ چوتھے دن میں کولمبو کے لیے روانہ ہو گیا تو احمد پراتھا مجھے خدا حافظ کہنے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ وہ گھر سے بریانی کے دو پارسل بندھوا کر میرے لیے ساتھ لایا تھا۔ کہنے لگا۔

''میرے بھائی! اب جافنا آؤ تو ہوٹل میں نہیں' میرے غریب خانے پر ٹھہرنا۔ جاتے ہی خط ضرور لکھنا۔ میں نے تمہیں اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا ہے۔''

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ جافنا ریلوے اسٹیشن جگمگا رہا تھا۔ سنہالی' تامل اور بودھی بھکشو' عورتیں مرد ریل میں سوار ہو رہے تھے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے وسل دیا۔ احمد پراتھا نے مجھے گلے لگایا۔ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور ایک بار پھر تاکید کی کہ میں اسے خط ضرور لکھتا رہوں۔ ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پیچھے چھوڑنے لگی۔ پھر جافنا کا اسٹیشن پیچھے رہ گیا۔ جافنا کا شہر بھی پیچھے رہ گیا اور ٹرین سمندری پل کے اوپر سے گزرنے کے بعد ایک بار پھر سری لنکا کے تاریک گھنے جنگلوں میں داخل ہو گئی۔

جس طرف آنکھ اٹھاؤں............

کولمبو پہنچ کر میں نے احمد پراتھا کو شکریے کا خط لکھا۔

اس کے جواب میں احمد پراتھا نے لکھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا دینی بھائی ہونے کے وجہ سے فرض تھا۔ ہماری ایک دوسرے سے خط و کتابت شروع ہو گئی۔ یہ ناممکن تھا کہ میں ٹمپل روڈ کی یاترا نہ کرتا۔ چنانچہ جافنا سے آتے ہی دوسرے روز تیسرے پہر میں ٹمپل روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ ہمارے بوریلا جنکشن والے علاقے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں پیدل ہی فٹ پاتھ پر چل پڑا۔ پراسرار تامل لڑکی کے مکان کے پاس پہنچ کر میرے قدم اپنے آپ سست پڑ گئے۔ میں سامنے والے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ پراسرار لڑکی کے مکان کے سامنے ذرا پرے ہٹ کر ایک سنہالی کی چائے کی دکان تھی۔ میں اس چائے خانے میں آ کر بیٹھ گیا۔ دکان سڑک سے ذرا اونچی تھی۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں سے مجھے سامنے پراسرار لڑکی کا مکان نظر آ رہا تھا۔ مکان کے آنگن کا برآمدے والا حصہ بھی نظر میں تھا۔ کیا یہ پراسرار لڑکی ابھی تک واپس نہیں آئی؟ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ میں کچھ دیر بیٹھا چائے پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس لڑکی

کا کوئی حقیقی وجود بھی ہے کہ نہیں۔ کہیں یہ میرا وہم ہی تو نہیں تھا۔ سامنے مکان خالی تھا۔ الگنی پر کوئی ساڑھی کپڑا بھی نہیں پڑا تھا۔ میں چائے خانے سے نکل کر آگے چلنے لگا۔ میرا دل جانے کیوں اداس ہو گیا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے اگربتیوں اور لوبان کی خوشبوئیں محسوس ہوئیں۔ بودھ معبد ایسا تھا کہ تین چار سیڑھیاں چڑھ کر آگے دالان آتا تھا۔ دالان کی دونوں جانب گھنے درخت اوپر جھکے ہوئے تھے اور سامنے مخروطی گنبد والا گوتم بدھ کا چھوٹا سا مندر تھا جس کے تین دروازے تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے میری نگاہیں خود بخود معبد کی طرف اٹھ گئیں۔

میں وہیں رک گیا۔ دالان کی ایک جانب کنول کے پھول ایسی بارہ دری کے پاس وہی پراسرار لڑکی ہاتھ میں پیتل کی تھالی لیے زرد ساڑھی پہنے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کے کھلے بالوں میں کنول کا سفید پھول لگا تھا اور پیتل کی تھالی میں رجنی گندھا کی سفید کلیاں رکھی تھیں۔ میرے قدم جیسے اپنے آپ معبد کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ پراسرار لڑکی نے ایک ادائے خاص سے گردن بلند کرتے ہوئے مجھے دیکھا اور مندر کے دروازے کی طرف چل دی۔ میں دالان میں پہنچ کر بارہ دری کے پاس ٹھہر گیا۔ گوتم بدھ کے معبدوں میں چاہے کوئی بھی جا سکتا تھا۔ وہاں ہندو مندروں کی طرح گھٹنے کو ہاتھ سے بجانے کی ضرورت نہیں تھی نہ کوئی مہنت ماتھے پر ٹیکا لگاتا تھا۔ پراسرار لڑکی معبد کے اندر جا چکی تھی۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ میں بھی معبد کے دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ گوتم بدھ کی یہاں ایک مورتی وسط میں ایک چاندی کے چبوترے پر رکھی ہوئی تھی۔ اردگرد موم بتیاں اور لوبان سلگ رہا تھا۔ سامنے پھولوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مورتی سونے کی تھی یا اس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ پراسرار لڑکی نے مورتی کے قدموں میں رجنی گندھا کے پھول رکھے اور ماتھا ٹیک کر میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ میں بھی باہر آ گیا۔

وہ کنول پھول ایسی بارہ دری کے پاس جا کر رک گئی۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ تیسرے پہر کا وقت تھا۔ درختوں میں چڑیاں بول رہی تھیں۔ پراسرار لڑکی نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور اپنے لمبے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں جرات سے کام لے کر اس کے پاس آ گیا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی کیسری آنکھوں میں وہی مقناطیسی کشش تھی۔ مجھ پر جیسے ایک سحر سا طاری ہونے لگا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو اس کی آنکھوں کے سحر سے نکال لیا۔ اور اس کی کلائی پکڑی۔ دل میں سوچا اگر یہ کوئی بھوت پریت ہے تو فوراً غائب ہو جائے گی۔ پراسرار لڑکی کی کلائی گرم تھی اور اس کے زرد ملبوس میں سے لوبان اور رجنی گندھا کی دھیمی دھیمی مہک آ رہی تھی۔ جونہی میں نے اس کی کلائی پکڑی۔ لڑکی کی آنکھوں میں شعلہ سا چمکا اور اس نے اپنی کلائی جھٹک کر چھڑائی اور تیز تیز قدموں

سے ساڑھی سنبھالتی معبد کی سیڑھیاں اتر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ٹمپل روڈ پر ٹریفک جاری تھی۔ کافی رش تھا۔ فٹ پاتھ پر وہ تھوڑی دور تو مجھے دکھائی دی پھر میری نظروں سے یوں اوجھل ہو گئی جیسے اچانک غائب ہو گئی ہو۔ میں واپس چائے خانے میں آ کر بیٹھ گیا جس کے سامنے اس پراسرار لڑکی کا گھر تھا۔ میں آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا۔ میں نے تین پیالیاں چائے کی خالی کر دیں مگر وہ لڑکی اس مکان میں نہ آئی۔ مکان اسی طرح خالی خالی تھا۔ آنگن بھی ویران تھا اور برآمدے کی کرسی بھی اسی طرح خالی پڑی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ یہ لڑکی انسان ہے یا چھلاوہ۔ میں چھلاوے سے بھی ملنے کو تیار تھا لیکن وہ میرے سامنے تو آئے۔ جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں چائے خانے سے اٹھ کر گھر کی طرح چل پڑا۔

ریڈیو سیلون کا جو انگلش سیکشن تھا اس میں وکٹر پول نام کا ایک امریکی نوجوان بھی تھا' جو میوزک کا پروگرام کرتا تھا۔ دراز قد' منحنی سا یہ امریکی بڑا باتونی تھا۔ ایک بار ہمارے کمرے میں داخل ہوا تو اتفاق سے گراموفون پر لنکاں لمیاں نی مائے۔ دھیاں کیوں جمیاں نی مائے پنجابی لوک گیت بج رہا تھا۔ وکٹر پول نے اندر آتے ہی گیت کی دھن پر رقص شروع کر دیا۔ وہ چٹکی بجا رہا تھا اور گردن کندھے ہلا ہلا کر تھرک تھرک کر رقص کر رہا تھا۔ ریکارڈ ختم ہوا تو کیپٹن ملک سے بولا۔ "سر! یہ ریکارڈ ایک گھنٹے کے لیے دے دیجئے۔ میں اس کے میوزک اور دھن پر ایک انگریزی دھن کمپوز کرنا چاہتا ہوں۔" وکٹر پول کو پنجاب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ خدا جانے وہ کس لیے یہ ساری ریسرچ کر رہا تھا۔ ایک دن میری میز پر آ کر کہنیاں ٹکا کر بولا۔

"یہ لفظ پنج آپ ہے یا پنج آب؟"

کیپٹن ملک کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی تو انہوں نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک ہسپانوی نرس رکھ لی۔ اس سرخ و سفید ہسپانوی نرس کا نام مس ڈی لاپول تھا۔ ناک بیٹھا ہوا تھا' چہرہ چوکور تھا اور گالوں پر سرخ تل بکھرے ہوئے تھے۔ بال سنہری تھے۔ آنکھیں نیلی تھیں اور آواز بڑی تیز تھی۔ وہ صبح شام دو وقت آتی تھی۔ کیپٹن ملک کے ہاں تو ہر وقت سدا ورت لگا رہتا تھا۔ مس ڈی لاپول کو تنخواہ کے علاوہ کیپٹن ملک کے گھر سے مہینے بھر کا پورا فوجی راشن بھی ملتا تھا جس میں ٹن فوڈ اور پورٹ وائین کے علاوہ سگریٹوں کے ڈبے بھی ہوتے تھے۔ گھی شکر چائے چاکلیٹ اور اوولٹین بھی اسی راشن میں شامل تھی۔ مس ڈی لاپول خود سگریٹ نہیں پیتی تھی۔ مس جونز کو جب معلوم ہوا کہ کیپٹن ملک مس ڈی لاپول کو اتنا زیادہ راشن ہر مہینے دیتے ہیں اور اس راشن میں سینئر سروس کے سگریٹ بھی ہوتے ہیں تو ایک روز میرے سامنے اس نے کیپٹن ملک سے کہا۔

"مسٹر ملک! یہ مس ڈی لاپول تو آپ کو لوٹ رہی ہے۔ جب آپ اسے اتنی زیادہ تنخواہ دیتے ہیں تو پھر راشن دینے کی کیا

ضرورت ہے۔وہ سینئر سروس کے سگریٹ آخر کیوں لیتی ہے جبکہ وہ سگریٹ نہیں پیتی۔''

کیپٹن ملک نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔''جس سے وہ شادی کرنے والی ہے وہ لڑکا سگریٹ پیتا ہے۔''

یہ بھی ایک ہسپانوی جوان تھا جو شام کے وقت اپنی منگیتر مس ڈی لاپول سے ملنے بنگلے پر آجاتا تھا۔جیسی ڈی لاپول تھی ویسا ہی اس کا منگیتر تھا۔دونوں تھوڑی دیر کے لیے کوٹھی کے لان میں ایک طرف بانس کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔سر کے ساتھ سر جوڑ کر باتیں شروع ہوجاتیں۔میں کمرے میں ریڈیو لگائے انہیں کھڑکی میں سے دیکھا کرتا۔مس ڈی لاپول ویسے بڑی ہنس مکھ اور باتونی تھی مگر اپنے منگیتر کے پاس بیٹھتے ہی اس کے منہ پر چپ کا تالا لگ جاتا تھا۔مجھے ایسے لگتا کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ایک پل کے لیے سر اٹھاتے اور پھر سر جھکا کر غم کے سمندر میں غوطہ زن ہوجاتے۔خدا جانے وہ کس قسم کی شادی کر رہے تھے کہ انہیں میں نے اکٹھے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔

ریڈیو سیلون کے امریکی یا انگلش سیکشن میں مس روتھ بھی ہوتی تھی۔یہ امریکی خاتون چوڑی چکلی تھی اور اس کے چہرے پر بھی بے شمار سنہری تل تھے۔بالوں کو اچھال اچھال کر چلتی تھی اور ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔عمر چالیس کے قریب تھی۔صوبیدار پیارا سنگھ اس پر فریفتہ تھا اور اسے دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے انگلش سیکشن میں چلا جاتا تھا۔مس روتھ بقول وکٹر پول کے تین خاوندوں کو ہضم کر چکی تھی اور اب کسی بحری ڈاکو سے شادی کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں صوبیدار پیارا سنگھ دفتر میں بھیگی بلی بن کر رہتا تھا۔کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔بس اپنے کام میں جتا رہتا ہے۔لیکن مس روتھ کے کمرے میں دن میں دو چار پھیرے ڈالنے نہیں بھولتا تھا۔کرسمس کے موقع پر پیارا سنگھ نے مس روتھ کو ایک قیمتی تحفہ بھی دیا تھا۔جس کی خبر آفس میں سب کو ہوگئی۔حوالدار پیارے لعل نے تحفے کے بابت دل میں ذکر کیا تو صوبیدار پیارا سنگھ نے اسے اپنی خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''فیر نہ ایہ گل کریں نہیں تے گنڈ چھڈ ااں گا تینوں۔''

صوبیدار پیارے لعل کان کھجاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کولمبو میں برسات کا موسم شروع ہوگیا تھا۔کالی کالی گھٹائیں گھر گھر کر آتیں۔سمندر کی طرف سے مرطوب ہوائیں تو صبح و شام چلتی رہتی تھیں۔ساون کی گھٹائیں چھاتیں تو یہ ہوائیں ٹھنڈی ہوجاتیں۔ہمارے بنگلے سے کچھ دور چوک میں امیگریشن والوں کا کوئی دفتر تھا۔یہاں اونچے اونچے گھنے درخت تھے۔ان درختوں کی طرف سے موسلا دھار بارش بے پناہ شور مچاتی آگے بڑھتی اور پھر اندھا دھند مینہ برسنا شروع ہوجاتا۔گھٹائیں ایک بار خوب کھل کر برستیں۔پھر بادلوں کا ایک قافلہ گزر جاتا اور دوسرا قافلہ آکر آسمان پر

ڈیرے ڈال لیتا۔ بادل آپس میں گھل مل جاتے اور آسمان کا رنگ سلیٹی ہو جاتا۔ اب جو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوتی تو اس کا سلسلہ کبھی دو روز' کبھی تین تین روز تک جاری رہتا۔ بوندا باندی ختم ہو جاتی تو بادل اسی طرح چھائے رہتے۔ پندرہ پندرہ بیس بیس روز تک سورج کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کبھی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں تو کبھی اس قدر حبس ہو جاتا کہ جی چاہتا کپڑے نوچ کر آدمی سمندر میں کود جائے۔ کولمبو کی سڑکیں سوائے پیٹہ کے علاقے کے سبھی کشادہ پختہ اور درختوں سے گھری ہوئی تھیں۔ چاہے کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو پانی ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہرتا تھا۔ پیٹہ کا علاقہ گنجان تھا۔ اجناس کی منڈی تھی۔ وہاں بارش میں کیچڑ بھی ہو جاتا تھا۔ جس بینک میں ہمارے ریڈیو سیلون کے چیک کیش ہوتے تھے وہ اسی علاقے میں واقع تھا۔ میں مہینے میں دو ایک بار اپنا چیک پیش کرانے یہاں جاتا تو ٹوکن لے کر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ جبار صاحب کی آڑھت والی دکان وہاں سے کافی دور تھی۔ یہاں میں اناس کھاتا اور چائے پیتا۔ اس کے بعد چیک کیش کروا کر واپس بوریلا جنکشن آ جاتا تھا۔ کولمبو کی سب سے خوبصورت کشادہ سڑک کا نام ''گال'' ہے۔ یہ سڑک سمندر کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ لائٹ ہاؤس سے لے کر گال نامی ایک چھوٹے سے شہر تک چلی جاتی ہے۔ اس کی ایک جانب سمندر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ لیفٹیننٹ صدیقی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ سڑک ۷۵ میل لمبی ہے اور آخر تک اس کی ایک جانب سمندر اور دوسری جانب خوبصورت عمارتوں کا سلسلہ جاتا ہے۔ مگر میں اس سڑک پر ماؤنٹ لیوینیا کلب تک ہی گیا تھا۔ جس طرف سمندر تھا ادھر خوبصورت ڈھلوان سرخ چھتوں والے بنگلے بھی تھے۔ ہر چار پانچ بنگلوں کے بعد ایک پتلی سی سڑک آ جاتی جو ناریلوں میں گھری دور سمندر کے ساحل تک جاتی تھی۔ ماؤنٹ لیوینیا کولمبو کی خوبصورت ترین اور طویل بیچ (Beach) ہے۔ یہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے اور ملکی اور غیر ملکی مرد اور عورتیں نہانے کے لباس میں سمندر کی لہروں میں تیرتے اور دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ساحل سمندر بہت وسیع ہے۔ سمندر کی نیلی بڑی بڑی لہریں زور زور سے آ کر ساحل کی ریت کا منہ چومتی ہیں اور پھر بڑے سکون سے واپس چلی جاتی ہیں۔ ان درختوں کے نیچے سنہالی مزدور عورتیں اور مرد ناریل کی چھال کی رسیاں بنا کرتے ہیں۔ آگے جا کر ان درختوں کے نیچے ایک چھوٹا سا کیبن ہے جس میں کافی ہاؤس بنا ہوا ہے۔ دور تک لوہے کی کرسیاں اور میزیں بچھا دی گئی ہیں۔ سیاح مرد عورتیں یہاں بیٹھ کر کافی سے جی بہلاتی ہیں۔ شام کو سیر کرنے آنے والی سنہالی اور تامل عورتیں بھی بچوں اور اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں کافی پیتی نظر آ جاتی ہیں۔

ایک روز آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مجھے ریڈیو سیلون پر کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے دفتر سے باہر نکل کر ٹیکسی پکڑی اور ساحل سمندر پر آ گیا۔ دن کا وقت تھا مگر ساحل پر کافی رونق تھی۔ میں کچھ دیر سمندر کی نیلی لہروں کو ساحل سے

ہم آغوش ہو کر واپس جاتے دیکھتا رہا۔ پھر ناریل کے درختوں میں آ گیا۔ یہاں سنہالی مرد اور عورتیں بڑے بڑے کر گھے لگائے ناریل کی چھال کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ زمین پر جگہ جگہ ناریل گرے پڑے تھے' جنہیں کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں نے سوچا' کافی پی جائے اور میں ان درختوں کے نیچے بنے ہوئے کیبن کی طرف چلنے لگا۔ کیبن کے باہر کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں کافی کا مگ لے کر ایک کرسی پر بیٹھ کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا جو ناریل کے درختوں کے بیچ میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو سمندر کی طرف سے کافی کیبن کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے زعفرانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور اس کے لمبے سیاہ بال سمندری ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ ناریل کے درختوں میں سے نکل کر قریب آئی تو میں اپنی جگہ دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔

یہ وہی ٹمپل روڈ والی پراسرار عورت تھی۔

جنم جنم کی پکار

زعفرانی ساڑھی میں ملبوس یہ وہی لڑکی تھی۔

میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے جو مرطوب ہوا آ رہی تھی اس میں اس جامنی رنگ کی پراسرار لڑکی کے کھلے بال اڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ناریل کے ایک درخت کی اوٹ میں آ کر رک گئی۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اب وہ بھی میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ایسے ہی مسکراتے ہوئے اس نے چند روز پہلے مجھے ٹمپل روڈ والے چوک سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تب اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ بھی ہلایا تھا۔ میرے ہاتھ میں کافی کا کپ تھا اور میں جیسے بت بنا اس اسرار انگیز لڑکی کو تک رہا تھا۔ بادلوں میں ہلکی ہلکی گرج کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ٹپاٹپ بوندیں گرنا شروع ہو گئیں۔ اگرچہ ہمارے اوپر ناریل کے درختوں کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں لیکن ناریل کے درخت اتنے گنجان نہیں ہوتے۔ پراسرار لڑکی نے چہرہ اوپر اٹھا کر بادلوں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے اڑتے ہوئے لمبے بالوں کا جوڑا بنا کر پیچھے باندھا اور درختوں میں ایک طرف چلنے لگی۔ میں جلدی سے کرسی پر سے اٹھا' اوپن ایئر کافی ہاؤس والے لڑکے کو کافی کے پیسے دیئے اور پراسرار لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بونداباندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ سیلون میں بارشیں بڑی شدید ہوتی ہیں اور کالی گھٹائیں جب امڈ امڈ کر آتی ہیں تو پھر اچانک موسلادھار بارش شروع ہو جاتی ہے لیکن اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی سے بارش کا آغاز ہوا تھا۔ لڑکی ناریل کے درختوں میں ساحل سمندر کے متوازی چل رہی تھی۔ وہاں سے راستہ اوپر گال روڈ کی طرف بھی جاتا تھا' لیکن

وہ سڑک کی طرف نہیں جارہی تھی۔ اس کی زعفرانی ساڑھی کا پلو سمندری ہوا میں بار بار پھڑ پھڑا رہا تھا۔

شاید اسے معلوم تھا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔ بس اس نے ایک جگہ پہنچ کر گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی سحر انگیز مسکراہٹ تھی' جیسے وہ جانتی ہو کہ میں اس کے تعاقب میں ضرور آؤں گا۔ میں صرف یہ معمہ حل کرنا چاہتا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ میں خود بھی اسرار پسند ہوں اور پراسرار چیزیں مجھے بہت متاثر کرتی ہیں۔ لڑکی میرے آگے آگے مجھ سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر چل رہی تھی۔ وہ جس طرف جارہی تھی ادھر کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ساحلی چٹانوں میں ایک پرانے لائیٹ ہاؤس کا مینار تھا۔ یہ مینار اب ویران ہو چکا تھا اور اس کی بجائے وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر سمندر کے اندر بڑھی ہوئی تکون کی پہاڑی پر ایک نیا جدید برقی آلات سے مزین لائیٹ ہاؤس بنایا گیا تھا۔ پرانے لائیٹ ہاؤس میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے بھی نہیں تھے اور زینے کا دروازہ بھی سمندری ہواؤں نے توڑ ڈالا تھا۔ اس کی پہلی منزل کی گول آدھی دیوار ساحلی جھاڑیوں میں چھپ گئی تھی۔ سمندر کی سیر کرتے ہوئے میں کئی بار اس ویران لائیٹ ہاؤس کے قریب سے گزرا تھا۔ لوگوں نے توہم پرستی کی وجہ سے یہ بات مشہور کردی تھی کہ اس لائیٹ ہاؤس میں لنکا کے قدیم راجہ راون کی بیٹی کی بدروح رہتی ہے۔ چنانچہ ناریل اٹھانے والے مزدور اور رسیاں بٹنے والی سنہالی مزدور عورتیں دن کے وقت بھی اس لائیٹ ہاؤس کی طرف نہیں آتی تھیں۔

میں اپنی پراسرار پسندی کی وجہ سے اس آسیبی لائیٹ ہاؤس کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ دل میں یہ خیال لیے ہوئے کہ لنکا کے راجہ راون سے تو ملاقات نہیں ہو سکی شاید اس کی بیٹی راجکماری سے ہی اس بہانے ملاقات ہو جائے۔ جہاں تک بدروحوں اور چڑیلوں کا تعلق ہے' میرا ایمان ہے کہ اگر انسان کو خدا پر بھروسہ ہو اور اس کے دل میں صرف خدا کا خوف ہو تو دنیا کی کوئی چڑیل یا بدروح اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ تمام چیزیں خود انسان سے ڈرتی ہیں۔ ہاں اگر انسان خود ان سے ڈرنے لگے تو پھر وہ اسے خوب ڈراتی ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کا اپنا وہم ہی کسی بدروح یا چڑیل کی شکل میں مجسم ہو کر سامنے آجاتا ہو۔ کیونکہ ہمارے بعض خیال چڑیلوں اور بدروحوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان خیالوں کو مجسم کر دیں تو یقینی بات ہے کہ وہ چڑیل یا کسی بدروح کی شکل اختیار کرلیں گے۔

بہرحال میں اپنے خیالات میں گم پراسرار زعفرانی ساڑھی والی سنہالی لڑکی کے پیچھے پیچھے چلا جارہا تھا۔ مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ یہ پراسرار لڑکی سنہالی نہیں بلکہ تامل ہے۔ لیکن وہ سنہالی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ ناریل کے درختوں کے نیچے چلتے ہوئے بائیں جانب سمندری چٹانوں کے قریب ہوتی جارہی تھی۔ پرانا آسیبی لائیٹ ہاؤس اب سیاہ بادلوں کے پس منظر میں سامنے نظر آنے لگا تھا۔

سمندری لہریں تیز ہوا میں دور دور سے آ کر لائیٹ ہاؤس کے سامنے کی جانب والی چٹانوں سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھیں۔ میں ایک درخت کے پاس رک گیا۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ لڑکی بھی ایک لمحے کے لیے رک گئی۔ اس نے گردن موڑ کر میری طرف اپنے مخصوص انداز میں دیکھا۔ ہاتھوں سے اپنا جوڑا کھول دیا اور ویران لائیٹ ہاؤس کی طرف بڑھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے لائیٹ ہاؤس کی طرف آنے کی دعوت دے رہی ہے لیکن میں اپنی جگہ رک گیا تھا۔ جانے کیوں میں آگے قدم نہیں اٹھا رہا تھا۔ ویران لائیٹ ہاؤس کا ٹوٹا ہوا دروازہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکی چٹانوں کے درمیان سے گزرتی لائیٹ ہاؤس کی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لائیٹ ہاؤس کے ٹوٹے ہوئے دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور لائیٹ ہاؤس کی ویران عمارت میں داخل ہو گئی۔ میں کچھ دیر بالکل ساکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ بادل زور سے گرجے اور ایک دم سے باقاعدہ بارش شروع ہو گئی۔ اس وقت تیز بارش سے چھپنے کے لیے صرف ویران لائیٹ ہاؤس ہی مجھے مناسب جگہ معلوم ہوئی۔ ویسے بھی میں کھوج لگانا چاہتا تھا کہ وہ پراسرار لڑکی اندر کیا کرنے گئی ہے اور مجھے کیوں اپنے پیچھے چلے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں تیز تیز چلتا لائیٹ ہاؤس کے شکستہ دروازے پر پہنچا اور اندر داخل ہو گیا۔ لائیٹ ہاؤس ایک مینار کی طرح ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کی پہلی منزل میں ایک چھوٹا سا گول کمرہ ہوتا ہے جس سے سٹور کا کام لیا جاتا ہے۔ پھر زینہ چکر کھاتا ہوا اوپر والی منزل میں جاتا ہے جہاں روشنی کے لیے بڑے بڑے برقی لیمپ لگے ہوتے ہیں۔

اس لائیٹ ہاؤس کا زینہ پتھر کا تھا اور وہاں جو سٹور تھا اس کا دروازہ بھی غائب تھا۔ اگرچہ دن کا وقت لیکن کالی کالی گھٹاؤں کی وجہ سے روشنی کافی ماند پڑ گئی تھی۔ میں نے سٹور میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں سوائے پتھروں کے ڈھیر کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے لڑکی اوپر گئی تھی۔ باہر سمندری لہروں کے شور میں اب تیز بارش کا شور شامل ہو گیا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور پتھریلا زینہ چڑھنے لگا۔ یہ زینہ پہلی دوسری اور تیسری منزل کے گرد اندر ہی اندر چکر کھاتا ہوا اوپر والی آخری منزل کی طرف چلا گیا تھا۔ زینے میں اندھیرا تھا اور فضا مرطوب تھی۔ ہر منزل میں دیوار میں پتھر ہٹا کر چھوٹا سا شگاف رکھا گیا تھا جس میں سے دن کی پھیکی روشنی اندر آتی تھی۔ یہاں سے گزرنے کے بعد پھر گھپ اندھیرا ہو جاتا۔ میں دل میں کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا کہ اگر یہاں واقعی کوئی بدروح ہے تو اس کا مجھ پر اثر نہ ہوا۔ میں لائیٹ ہاؤس کی چوتھی منزل پر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ پراسرار جامنی رنگت والی لڑکی یقینی طور پر چوتھی منزل میں ہی ہو گی لیکن یہ دیکھ کر میں کچھ دہشت زدہ سا ہو کر رہ گیا کہ وہ لڑکی چوتھی منزل پر بھی نہیں تھی۔ اس منزل کے گول شکستہ کمرے میں سوائے پتھر کے ایک گول چبوترے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ فرش بھی اکھڑا ہوا تھا۔ گول دیواروں کی کھڑکیوں کے شیشے لوگ اتار کر

لے گئے تھے۔سمندر کی تیز ہوا کے ساتھ بارش کے چھینٹے اندر آ رہے تھے۔ میں نے چبوترے کے پاس رک کر چاروں طرف دیکھا۔

میری بائیں جانب نیچے ناریل کے درخت ہواؤں اور تیز بارش میں جھوم رہے تھے۔ سامنے دونوں اطراف دور تک گہرا سبز سمندر پھیلا ہوا تھا جس کی موجیں دور دور سے آ کر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ بارش اندر تک آ رہی تھی۔ پر اسرار لڑکی میری آنکھوں کے سامنے لائیٹ ہاؤس کی عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ پھر وہ کہاں گم ہوگئی؟ نیچے اسٹور بھی خالی تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ اوپر والا کمرہ بھی خالی تھا۔ تو کیا اس نے اوپر سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی؟ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ تیز بارش میں نیچے چٹانیں بھیگ رہی تھیں۔ وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اتنی سی دیر میں بارش نے مجھے بھگو ڈالا تھا۔ معاملہ پر اسرار سے پر اسرار تر ہوتا جا رہا تھا۔ سچی بات ہے مجھے اپنے دل میں کچھ دہشت بھی محسوس ہوئی۔ شاید یہ انسانی فطرت کا تقاضا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسراریت کا کھوج لگانے اور توہمات کی دھند کے پار اتر کر دیکھنے کا جذبہ بھی میرے دل میں موجود تھا۔ میں اس پر اسرار لڑکی کے معمے کو حل کرنا چاہتا تھا یا اگر مادی وجود اور مادی حقائق سے آگے کوئی پر اسرار دنیا موجود تھی تو اس کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اتنا مجھے یقین ہے اور اب بھی ہے کہ جب تک انسان کے دل میں خدا کا خوف موجود ہے اسے دنیا کی کوئی شے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

میں نیچے آ گیا۔ ایک بار پھر اسٹور میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں سوائے زنگ آلود پتھروں کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں تھا۔ بارش ایک دم رک گئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور آسیبی لائیٹ ہاؤس کی ویران عمارت سے نکل کر درختوں میں ساحل سمندر والے پر سکون رومانٹک کافی ہاؤس کی طرف چلنے لگا۔ اس وقت مجھے کافی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ جونہی میں کافی ہاؤس کے کیبن کے قریب آیا میرا دل دھک سے رہ گیا۔ زعفرانی ساڑھی والی جامنی لڑکی کیبن کے اندر ناریل کے درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں اس کے سیاہ کھلے بال آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ کافی بڑے شائستہ انداز میں اس نے میز پر رکھ دی اور میری طرف گردن کو ذرا سا ٹیڑھا کر کے دیکھا۔ میں یہ موقع ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے قریب آ کر رک گیا اور انگریزی میں بولا۔

''کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟''

انگریزی میں میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ جنوبی ہند اور لنکا میں جس کو ان کی زبان نہ آتی ہو وہ انگریزی ہی میں بات کرتا ہے یا

پھرٹوٹی پھوٹی اردو میں۔ پراسرار لڑکی نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں انگریزی میں ہی اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ایک گہری خاموشی سی چھا گئی۔اس خاموشی کو صرف سمندری لہروں کی ہلکی ہلکی آواز ہی پریشان کر رہی تھی۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ پراسرار لڑکی نے اردو میں کہا۔

''تمہارے لیے کافی بناؤں؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔اس کی اردو بڑی صاف تھی۔ لہجہ بھی ٹھیک تھا۔ میں نے پوچھا۔''کیا تم اردو جانتی ہو؟''

اس نے خالی پیالی میں کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔

''میں ساری زبانیں بول لیتی ہوں۔''

اس کی آواز ایسی تھی جیسے وہ خواب میں باتیں کر رہی ہو۔اگر یہ ساری زبانیں جانتی ہے تو ضرور یہ کوئی بدروح ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔سمندر کی ہوا اس کی زعفرانی ساڑھی اور سیاہ بالوں کو چھو کر میری طرف آ رہی تھی اور اس میں ایک ایسی خوشبو تھی جو اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے کافی کا پیالہ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پراسرار لڑکی کے چہرے کا رنگ جامنی تھا اور ہونٹ گہرے براؤن کلر کے تھے۔اس کی کیسری رنگ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی۔ یہ آنکھیں اس دنیا کی لڑکی کی آنکھیں نہیں لگ رہی تھیں۔ میں اس راز پر سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا کہ وہ اصل میں کون ہے۔ میں نے کافی کا ہلکا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''تم نے یہ کون سی خوشبو لگائی ہوئی ہے؟''

وہ ناریل کے درختوں میں سے نظر آنے والے گہرے سبز سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ گہرا سانس بھرتے ہوئے خشک خواب آلود آواز میں بولی۔

''یہ خوشبو اس دنیا میں کہیں نہیں ہے۔''

میں نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ہم دونوں خاموش تھے۔تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔

''میں نے تمہیں لائیٹ ہاؤس میں جاتے دیکھا تھا۔ میں وہاں گیا' تم وہاں نہیں تھیں۔ تم وہاں سے یہاں کیسے آ گئیں؟''

پراسرار لڑکی نے گردن ترچھی کر کے مجھے مقناطیسی آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور بولی۔''میں یہاں بھی نہیں ہوں۔''

میرے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ضرور یہ لڑکی کوئی شر شرارتی یعنی بھوت پریت ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ ڈرامہ کر

رہی ہو ہو سکتا ہے لائیٹ ہاؤس کی سیڑھیوں میں کوئی خفیہ راستہ ہو جہاں سے یہ نکل کر مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گئی ہو۔ بعض انسان اپنے آپ کو پراسرار بنانے کے شوق میں خوابوں کی دنیا میں رہنے لگتے ہیں اور اپنے اردگرد ماورایت کا خودساختہ حلقہ سا بنا لیتے ہیں۔ یقیناً یہ لڑکی بھی ایسی ہی ہے۔ میں نے اس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں تمہارے ٹمپل روڈ والے مکان میں دیکھا تھا۔ پھر تم وہاں سے بھی چلی گئیں۔"

لڑکی نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اسے ذرا سا دبا کر بولی۔

"وہ میرا مکان نہیں ہے۔"

میں نے اس کے بظاہر چونکا دینے والے جواب پر بھی کوئی دھیان نہ دیا اور کہا۔

"تم نے مجھے ٹمپل روڈ والے چوک میں اپنی طرف بلایا تھا۔"

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور تھکی تھکی آواز میں کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں ہر جنم میں اپنی طرف بلایا ہے۔"

میں دل میں ہنس دیا۔ اب یہ ہندو یا بدھ مت عقیدے کے مطابق اپنے پچھلے جنم کی باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میں خاموشی سے کافی پینے لگا۔ ناریل کے درختوں پر سے بارش کا پانی ٹپ ٹپ ساتھ والی میز پر گر رہا تھا۔

لڑکی یا بدروح؟

میں نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور پراسرار لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ابھی تم تمہارا نام معلوم نہیں ہے۔ لیکن تم جو کوئی بھی ہو میں تمہیں یہ واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہارے جنم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور آواگون کو نہیں مانتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم جو کھیل رچا رہی ہو اسے اب ختم کر دو کیونکہ اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ میں ریڈیو سیلون پر ہوتا ہوں۔ ایک نارمل لڑکی کی طرح کسی بھی روز دن کے وقت ریڈیو سیلون کے آفس میں آؤ۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملاؤں گا۔ تمہیں سنہالی اور تامل گانے بھی سنواؤں گا اور آئس کریم بھی کھلاؤں گا۔"

اگر اس پراسرار لڑکی کے نام نہاد ڈرامے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا تو میری اس وضاحت کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جب تک میں بولتا رہا وہ ٹکٹکی باندھے ایسے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میرے پیچھے کسی دوسرے شخص کو دیکھ رہی ہو۔ مرطوب سمندری

فضا میں تمباکو کافی اور ناریل کی ہلکی ہلکی مرطوب مہک رچی ہوئی تھی۔ پراسرار لڑکی کی کیسری آنکھیں جیسے انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو اس نے اپنی پیالی میں چینک میں سے بچی کھچی کافی انڈیلی اور دودھ کے بغیر ہی گھونٹ نگل لیا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھنے سے زعفرانی ساڑھی میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور وہی خواب انگیز حیرت ناک عجیب سی بے مثال خوشبو میرے ہونٹوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم آہستہ آہستہ ناریل کے درختوں میں گیلی ریت پر چلنے لگے۔

وہ بولی۔۔۔۔۔۔۔

''میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو اور پنر جنم یعنی آواگون پر یقین نہیں رکھتے۔ مجھے تمہیں یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہر انسان کے لیے وہی مذہب مناسب ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ پیدا ہوتا ہے۔ تم آواگون یا پنر ملن پر یقین رکھو چاہے نہ رکھو' لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہارا میرا کئی جنموں کا ساتھ ہے۔ تم کسی بھی جنم میں میرے محبوب نہیں رہے۔ مگر میرے محبوب کے دوست ضرور رہے ہو۔ اور آخری بار جب میں نے اپنے محبوب کو قتل کیا تو تم بھی وہاں موجود تھے۔''

میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا کیا تم نے اپنی ایڈونچر کہانی میں جرائم کا عنصر بھی شامل کر دیا۔ اس سے کہانی کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔''

اس نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''میرا منشا اپنے محبوب کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے میری محبت کی' میری وفا کی توہین کی تھی۔ کم از کم میں یہی سمجھتی تھی لیکن جب میں نے اسے مار ڈالا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس پر غلط الزام لگایا گیا تھا۔ وہ بے قصور تھا۔ وہ میرے ساتھ پوری طرح سے وفادار تھا اور مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔''

میں نے سگریٹ سلگا لیا اور کہا۔

''کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

وہ دور سمندر پر نظریں جمائے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے قدم قدم چل رہی تھی' کہنے لگی۔

''میرے کس جنم کا نام پوچھ رہے ہو؟ لیکن خیر میں تمہیں اپنے آخری جنم کا نام بتائے دیتی ہوں کیونکہ اس کے بعد سے اب تک مجھے کوئی جنم نصیب نہیں ہوا۔ میں اس وقت تمہارے سامنے ایک زندہ عورت کی شکل میں موجود ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ میرا عارضی جنم ہے۔ میں نے ایک محبت کرنے والے سچے اور وفادار محبوب کو قتل کر کے جو گناہ کیا تھا مجھے اس کی سزا مل رہی ہے اور اس وقت تک

میں اس آگ میں جلتی رہوں گی اور اپنے باقاعدہ جنم تک یونہی بھٹکتی رہوں گی' جب تک کہ میں اپنے مقتول محبوب کو اس کے کسی جنم میں تلاش نہیں کر لیتی اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا نہیں کرتی۔ تمہاری طرف میرے متوجہ ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ تم ایک جنم میں میرے مقتول محبوب کے دوست رہ چکے ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب میں اپنے مقتول محبوب سے مل سکوں گی اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکوں گی۔ لیکن تم نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''تم نے ابھی تک مجھے اپنا شبھ نام نہیں بتایا۔''

وہ بولی۔

''میرے آخری جنم کا نام نارائی تھا۔ تم مجھے اسے نام سے پکار سکتے ہو۔ تمہارے دل میں میرے بارے میں جو یہ خیال آیا تھا کہ میں سنہالی نہیں تامل ہوں تو اسے ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دو۔ میں سنہالی ہوں' میں کئی ہزار برس سے سنہال میں پیدا ہوتی رہی ہوں؟''

''کئی ہزار برسوں سے؟''میں نے مذاق کے موڈ میں مصنوعی حیرت کے ساتھ اس سے پوچھا۔

نارائی نے میرے اس مذاق کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ کہے جا رہی تھی۔

''میں آخری بار لنکا کے نامور راجہ راون کے خاندان میں اس سے دو سو برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ میں شاہی خاندان کی راجکماری تھی۔''

بادلوں میں ہلکی ہلکی گرج سنائی دینے لگی۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ اس نے بادلوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

''میں ان بادلوں سے اتر کر آئی ہوں۔ اور اگر مجھے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا موقع نہ ملا تو ایک بار پھر نامعلوم مدت کے لیے واپس ان بادلوں میں چلی جاؤں گی۔''

میں نے نارائی کی طرف دیکھا اور ہنس کر کہا۔

''نارائی! تم بڑی اچھی اداکارہ ہو۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں ریڈیو کے کسی فیچر میں کام دلوا سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد لنکا کی مقبول ریڈیو آرٹسٹ بن جاؤ گی۔''

پراسرار سنہالی لڑکی نارائی نے میری اس طنز پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ بدستور اپنے ماضی میں گم تھی اور بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں نے اسے کہا کہ بارش آ رہی ہے' ہمیں کافی ہاؤس کے کیبن میں چل کر بیٹھنا

چاہیے۔ وہ اپنے مخصوص ماورایت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں جارہی ہوں' کل سہ پہر تم مجھے فورٹ ریلوے اسٹیشن کے فرسٹ کلاس ریفریشمنٹ روم میں مل سکتے ہو۔''

میں اس خیال پرست بلکہ ماضی پرست لڑکی کے نفسیاتی عوامل کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ لڑکی اپنی کسی تشنہ خواہش کی تکمیل کے لیے ڈھونگ رچائے ہوئے ہے کیونکہ میرے عقیدے کے مطابق دوسرا جنم نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ میں نے حامی بھرتے ہوئے پوچھا۔

''مگر تم کس لیے مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟''

وہ ایک سیکنڈ تک مجھے غور سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''میں تمہیں تم سے ملاؤں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ ناریل کے درختوں کی طرف چل پڑی۔ میں دل میں ہنس دیا۔ اس لڑکی کو اپنی خبر نہیں ہے یہ مجھے مجھ سے کیا ملائے گی۔ بہرحال وہ اپنے ڈھونگ میں جس قدر پختہ تھی اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ناریل کے ایک درخت کے پیچھے چلی گئی۔ درخت اتنے گنجان نہیں تھے۔ وہ ان درختوں میں میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکتی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا مگر وہ درخت کے پیچھے سے نہ نکلی۔ بارش کی بوندیں اب تیزی سے گرنے لگی تھیں۔ میں چلتے ہوئے اس درخت کے پاس گیا۔ اس درخت کا تنا کافی بڑا تھا' کم ازکم ایک آدمی اس تنے کے پیچھے چھپ سکتا تھا۔ میں نے دوسری طرف نگاہ ڈالی۔ پراسرار نارائنی وہاں نہیں تھی۔ میں ایک پل کے لیے دم بخود سا ہوکر رہ گیا۔ وہ ایک دو سیکنڈ پہلے میری آنکھوں کے سامنے اس درخت کے پیچھے گئی تھی۔ پھر وہ کہاں غائب ہوگئی؟ وہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں وہ روپوش ہوسکتی۔ میں کچھ سمجھتے کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہاں سے واپس روانہ ہوگیا۔ میری چھٹی کا دن تھا۔ گال روڈ پر آکر میں نے ٹیکسی پکڑی اور بوریلا جنکشن والی اپنی رہائش گاہ پر آگیا۔ ملک صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مسز جونز کچن میں کچھ پکا رہی تھی۔ سٹنگ روم میں مسالوں کی تیز خوشبو پھیلی تھی۔ اس کے دونوں لڑکے ایلن وغیرہ لان میں کھیل رہے تھے۔ میرا ذہن پراسرار نارائنی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی اصل میں کون ہے۔ ضرور اس کے پاس کوئی کالا علم ہے جس کے زور پر وہ ناریل کے درخت کے پیچھے غائب ہوگئی تھی' مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں کسی کالے علم کو بھی نہیں مانتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے انسان کو حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ مجھے اسرار اور ماورایت سے لگاؤ ضرور تھا لیکن میں اسے انسانی لاشعور کا کرشمہ ہی سمجھتا تھا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

دوسرے روز بھی کولمبو کے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔رات کو بارش ہوتی رہی تھی۔میں ایک بجے تک تو ریڈیو اسٹیشن پر ہی رہا۔ڈیوٹی سے آف ہونے کے بعد گھر واپس آیا۔کھانا کھایا اور مسز جونز کے پاس سٹنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔مسز جونز مجھے کہہ رہی تھی کہ میرے سینئر سروس کے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں تم نافی سے مجھے کچھ سگریٹ لا دو۔میں نے اسے کہا کہ میں اپنا راشن لے چکا ہوں۔کیپٹن ملک صاحب سے کہہ کر تمہیں کچھ پیکٹ لے دوں گا۔مسز جونز بڑی خوش ہوئی۔میرے لیے کافی بنا کر لے آئی۔میں بھی کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ساڑھے تین بجے میں آلمس پیلس والی کوٹھی سے نکلا اور پیدل ہی بملا پٹی کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔رات بھر بارش ہوتی رہی لیکن کولمبو کی دھلی دھلائی سڑکیں بالکل صاف تھیں۔نہ کہیں کیچڑ تھا نہ کہیں پانی کھڑا تھا۔درخت دھل کر سرسبز ہو گئے تھے۔کولمبو کی سڑکوں کی دونوں جانب ایک خاص قسم کے گھنے درخت تھے جن میں سرخ رنگ کے پھولوں کے گچھے تھے۔اس قسم کے چند ایک درخت میں نے لاہور میں بھی دیکھے ہیں۔ایک درخت تو گنگا رام کے سامنے امریکی سنٹر کے صحن میں لگا ہے کولمبو میں ان درختوں کی بھرمار تھی۔ہوا چلتی تو ان درختوں کے سرخ پھول سڑک پر گرتے رہتے تھے۔اس موسم میں جب فوجی اسٹیشن ویگن ہمیں گھر سے لے کر ریڈیو اسٹیشن آتی تو اس کے بونٹ پر ان درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرے ہوئے سرخ پھول پڑے ہوتے تھے۔میں فٹ پاتھ پر پیدل ہی چلا جا رہا تھا۔بملا پٹی کا علاقہ وہاں سے کافی دور تھا۔دو بلاک گزرنے کے بعد میں نے ٹیکسی لے لی کیونکہ فضا میں حبس کی وجہ سے گرمی زیادہ ہو گئی تھی۔کولمبو کے فورٹ ریلوے اسٹیشن پر کافی رونق تھی۔میں نے پلیٹ فارم ٹکٹ لیا اور فرسٹ کلاس ریفرشمنٹ روم کی طرف بڑھا۔پراسرار لڑکی نارائنی کونے والی ٹیبل پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ہم نے چائے پی۔وہ زیادہ دیر خاموش رہی' پھر بولی۔

"میں نے تمہیں آج اس لیے بلایا ہے کہ تمہیں تمہاری شکل دکھاؤں گی۔تم اپنی شکل پہچان لو گے نا؟"

میں مسکرا رہا تھا۔میرے مسکرانے کا انداز طنزیہ تھا۔پراسرار نارائنی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ"

اسٹیشن سے باہر نکل کر ہم نے ٹیکسی لے لی۔نارائنی نے ڈرائیور کو ایک ایسی جگہ چلنے کے لیے کہا جو کولمبو سے شمال کی طرف ریل میں جاتے ہوئے دوسرا ریلوے اسٹیشن تھا۔یہ جگہ وہاں سے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر تھی۔میں نے اس جگہ کا نام تو سنا ہوا تھا لیکن ادھر گیا کبھی نہیں تھا۔ٹیکسی کولمبو شہر سے نکل کر فیکٹری ایریا کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اپنی منزل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔یہاں کھیت بھی تھے اور ان کے ساتھ ساتھ گھنے درختوں کی قطاریں بھی ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔اس علاقے میں آبادی بالکل نہیں تھی۔کچھ دور تک

ڈھلانی چھتوں والی جھونپڑیاں اور بارکیں نظر آتی رہیں پھر ہم بالکل ہی ویران علاقے میں آ گئے۔ٹیکسی والا بھی کچھ پریشان سا تھا کہ یہ لوگ ادھر کیا کرنے جا رہے ہیں۔ایک چھوٹی سی جھیل کنارے پہنچ کر نارائنی نے ٹیکسی رکوالی۔ٹیکسی کا کرایہ اس نے خود ہی ادا کیا۔ٹیکسی والے نے خدا کا شکر ادا کیا اور جلدی سے ٹیکسی موڑ کر واپس چل دیا۔نارائنی مجھے ساتھ لے کر جھیل کنارے چلنے لگی۔جھیل میں کنارے کے ساتھ ساتھ چوڑے چوڑے پتوں کے درمیان سے کاسنی اور سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے کنول کے نازک پھول سر اٹھائے کھڑے تھے۔مجھے امرتسر یاد آ گیا۔امرتسر میں صبح صبح دیہاتی عورتیں کنول پھول بیچنے آیا کرتی تھیں۔لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے کنول انہوں نے اپنے کاندھوں پر ڈال رکھے ہوتے اور وہ "کمیاں لے لوکمیاں" کی آواز لگایا کرتی تھیں۔عورتیں ان کنول پھولوں کے زیور بناتی تھیں اور عطار انہیں خرید کر ان کا نیلوفر شربت تیار کرتے تھے۔کیا زمانہ تھا۔کنول پھول کا خالص ٹھنڈا شربت مل جاتا تھا۔اب کنول کا شربت تو دور کی بات ہے لوگ کنول کا نام تک بھول گئے ہیں۔ہم نیچر سے کس قدر دور ہو گئے ہیں۔کیا کبھی انسان واپس قدرت کی آغوش میں جا سکے گا؟

گھاٹی زیادہ گہری نہیں تھی۔ہم گھاٹی سے نکل کر دوسری طرف نکل گئے تو وہاں بانس اور جنگلی کیلوں کے جھنڈوں کے درمیان ٹوٹے پھوٹے سرخ پتھروں کے ایک چبوترے پر ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی نظر آئی۔بارش کی وجہ سے اس کی پتھریلی دیواریں سیاہ ہو چکی تھیں۔دروازے کا ایک بھی کیواڑ سلامت نہیں تھا۔کوٹھڑی کے اندر اندھیرا تھا۔میں نے نارائنی سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے یہ کھنڈر دکھانے یہاں لائی ہے۔وہ کوٹھڑی کے شکستہ بوسیدہ دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔پھر اس کی پیشانی پر لگے ہوئے پتھر کو غور سے دیکھا اور بولی۔

"جسے تم کوٹھڑی کہہ رہے ہو یہ آج یہ سینکڑوں برس پہلے ایک بہت بڑا معبد ہوا کرتا تھا۔خیر تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔میں جانتی ہوں تم دل میں کیا سوچ رہے ہو۔میرے ساتھ آؤ۔میں اندر تمہیں تمہاری شکل دکھاتی ہوں۔تمہیں تم سے ملاتی ہوں۔"

میں دل میں ہنسا۔یہ لڑکی پورا پورا ڈرامہ کر رہی ہے۔اس نے ضرور کوٹھڑی میں کہیں میری تصویر لگا رکھی ہو گی۔وہ میری تصویر ریڈیو اسٹیشن سے کسی کے بھی ذریعے حاصل کر سکتی تھی۔میں نے اس کے ڈھونگ کو فاش کر دینے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔میں اس کے پیچھے پیچھے پرانے کھنڈر میں داخل ہو گیا۔

کھنڈرات اور نارائنی

کھنڈر کی چھت ایک جانب سے بیٹھی ہوئی تھی۔

ٹھیک اس جگہ زمین کے اندر ایک شگاف بنا ہوا تھا۔ نارائنی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہیں اندر جاتے ہوئے ڈر تو نہیں لگے گا؟''

میں نے پوچھا۔''اس شگاف کے اندر کیا کوئی چڑیل رہتی ہے؟''

نارائنی نے کہا۔

''چڑیلوں کے علاوہ بھی بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے انسان ڈر جاتا ہے۔لیکن میں جانتی ہوں تمہارا اپنے خدا پر بڑا پختہ عقیدہ ہے اور تم سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔''

شگاف کے اندر ایک غار میں پتھر کا زینہ اترتا تھا۔ نارائنی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا کیونکہ غار میں اندھیرا تھا۔ زینہ اترنے کے بعد غار میں کچھ فاصلے پر ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی۔ غار کی چھت اونچی تھی۔ کہیں کہیں دیوار پر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ نارائنی ایک بدروح کی طرح بالکل سیدھی ہو کر مجھ سے ذرا آگے چل رہی تھی۔ غار کی دھندلی فضا میں وہ مجھے کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ جس جگہ ہلکی ہلکی روشنی تھی وہاں ایک پتھر کی دیوار ایک چھوٹے سے چبوترے پر کھڑی تھی۔ دیوار کے ساتھ ہی ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کی محراب باقی رہ گئی تھی۔ اس دیوار پر جو روشنی پڑ رہی تھی وہ غار کی چھت کے ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے آرہی تھی۔ نارائنی دیوار کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''آؤ اور اپنے آپ کو پہچانو۔''

میں اس کے قریب ہو گیا۔ دیوار پر ایک منظر پھولوں میں سے تصویر کی شکل میں ابھرا ہوا تھا۔ اس منظر میں ایک عورت ایک آدمی کے سینے میں خنجر گھونپ رہی تھی۔ یہ آدمی تخت پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا ایک بازو اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ خنجر والی عورت کی شکل ہو بہو نارائنی سے ملتی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک دوسرا نوجوان حیرت کے عالم میں دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے دہشت زدہ کھڑا تھا۔ نارائنی نے کہا۔

''تم نے مجھے تو پہچان لیا ہوگا۔ ہاں یہ میں ہوں جو اپنے ہرجائی خاوند کو قتل کر رہی ہے۔ مجھے اس وقت یہی یقین تھا کہ میرا خاوند ہرجائی ہے اور اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ اب اپنے آپ کو پہچانو۔ یہ تم ہو جو میرے خاوند کے قریب کھڑے مجھے قاتلانہ حملہ دیکھ کر خوفزدہ ہو رہے ہو۔ یہ حملہ میں نے اچانک کر دیا تھا۔ تم میرے خاوند کے ساتھ یہاں باتیں کر رہے تھے کہ میں اندر آگئی۔ پھر میں نے اچانک اپنی ساڑھی میں چھپایا ہوا خنجر نکال کر اپنے خاوند کو قتل کر دیا۔ غور سے اپنی شکل دیکھو کیا یہ تم نہیں ہو۔''

میں نے جھک کر دیوار پر ابھری ہوئی شکل کو غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نوجوان بت کے نقش بالکل میرے ایسے تھے مگر یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ ویسے پتھر کی شکل اور میری شکل میں انیس بیس کا ہی فرق تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ جس بت تراش نے یہ منظر پتھر کی دیوار پر تراشا تھا اس میں سے ایک آدمی کے نقش مجھ سے ملتے تھے۔ میں نے نارائنی کی طرف پلٹ کر دیکھا اور کہا۔

"تم آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟ ایک بات میں نے شروع میں ہی تم پر واضح کر دی تھی اور اب بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آواگون کا قائل نہیں ہوں۔ اب بولو تم کیا کہنا چاہتی ہو اور مجھے یہاں کس لیے لائی ہو؟"

پراسرار نارائنی اب بھی ٹکٹکی باندھے پتھر کی دیوار پر بنے ہوئے خونین منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ پھر اس کی خواب ایسی آواز بلند ہوئی۔

"جب میں مر رہی تھی تو تم میرے پاس تھے۔ میں نے مرنے سے پہلے تمہیں کہا تھا کہ میں نے اپنے خاوند سدھانتا کو قتل کر کے بڑا گناہ کیا ہے' میں جب تک اس گناہ کا کفارہ ادا نہیں کروں گی' میری روح کو چین کا جنم نصیب نہیں ہو گا۔ میں نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ اگر اگلے جنم میں بھٹکتے ہوئے تم سے ملاقات ہو گئی تو سدھانتا کو تلاش کرنے میں میری مدد کرنا تاکہ میں اپنے پاپ کا کفارہ ادا کر سکوں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میری مدد کرو گے۔ اب تقدیر نے اس جنم میں تمہیں مجھ سے ملا دیا ہے۔ تم مجھے نہیں پہچانتے مگر میں تمہیں پوری طرح پہچانتی ہوں۔ پہچانتی ہوں اس لیے یہ میرا کوئی باقاعدہ جنم نہیں ہے' یہ میرا زک کا عبوری دور ہے۔ کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟"

اس نے میری طرف پلٹ کر دیکھا۔ نیم روشنی میں اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ میرا وہاں دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے اس کی باتیں احمقانہ لگ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"میں یہاں سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ تمہیں یہاں کھڑے رہنا پسند ہے تو یہیں رہو۔ میں جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں غار کے زینے کی طرف چل پڑا۔ ہم کھنڈر سے باہر آ کر چبوترے کے قریب جنگلی کیلے کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس کھنڈر کو دیکھ کر کبھی خیال نہیں آ سکتا تھا کہ اس کے نیچے کوئی غار بھی ہو گا۔ نارائنی گھاس پر اپنی کتھئی رنگ کی ساڑھی کو سمیٹے بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے قائل نہیں کر سکی کہ پتھر کی دیواروں پر جو تصویر ابھری ہوئی تھی وہ میری یا اس کی تھی۔

"نارائنی! میرا خیال ہے کہ تم اب اس ڈرامے کو ختم کر دو تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ جوں جوں تم اس ڈرامے کو آگے بڑھا رہی ہو تم اپنے آپ ایکسپوز ہوتی جا رہی ہو۔ تم ایک جھوٹ ثابت کرنے کے لیے دوسرے جھوٹ کا سہارا لے رہی ہو اور یوں جھوٹ کے تانے بانے میں الجھتی چلی جا رہی ہو۔ آخر وہ وقت بھی آ جائے گا جب تم خود پکار اٹھو گی کہ تم اپنے آپ کو خواہ مخواہ پراسرار بنانے کے لیے یہ کھیل کھیل رہی تھیں۔"

نارائنی کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی' کہنے لگی۔

"کیا اپنی اور میری شکل دیکھ کر بھی تمہیں یقین نہیں آیا؟ دیوار پر کھدی ہوئی یہ تصویر سینکڑوں برس پرانی ہے اور میری موت کے بعد میرے خاوند کی ماتاجی کے کہنے پر بنائی گئی تھی تاکہ میرا یہ بھیانک قتل تاریخ میں ریکارڈ ہو جائے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں واپس کولمبو چلنا چاہیے۔ اگر یہاں بارش شروع ہو گئی تو پھر شاید ہمیں رات بھی اسی جگہ گزارنی پڑے گی۔"

نارائنی اٹھ کر میرے ساتھ چلنے لگی۔ ہم گھاٹی سے نکل کر اوپر جھاڑیوں کے پاس آئے تو اس نے پلٹ کر گھاٹی کے دوسرے کنارے والے درختوں کو دیکھا جن کے سائے میں قدیم معبد کا کھنڈر تھا۔ میں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اب میں اس نام نہاد پراسرار لڑکی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ خدا جانے یہ میری اسراریت پسندی تھی کہ ہر سفر میں مجھے ایک آدھ ایسی پراسرار عورت ضرور مل جاتی تھی۔ مگر یہ عورت مجھے نقلی اور جھوٹی لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"سمجھ نہیں آ رہا کہ یہاں ٹیکسی وغیرہ ہمیں کہاں اور کیسے ملے گی۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنا چاہیے تاکہ وہاں سے کولمبو کے لیے کوئی لوکل ٹرین پکڑ سکیں۔"

نارائنی آہستہ آہستہ بوجھل قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ مغرب کی طرف اس کی لالی آسمان پر پھیلنے لگی۔ بادلوں کا رنگ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ نارائنی نے کہا۔

"ریلوے اسٹیشن یہاں سے کافی دور ہے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"تو پھر کیا ہم یہاں سے کولمبو تک پیدل چلیں گے؟"

نارائنی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو پیدل چل سکتی ہوں' میں یہاں سے جافنا تک پیدل چل سکتی ہوں۔ لیکن اگر تم پیدل چلنا پسند نہیں کرتے تو میں ٹیکسی والے کو آواز دے کر بلا لیتی ہوں۔"

میں نے نارائنی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کوئی مارکیٹ ہے جو تم کسی ٹیکسی والے کو آواز دے کر بلا لو گی؟"

نارائنی بالکل نہ مسکرائی۔ اداس چہرے سے اس نے ایک طرف دیکھا۔ جس طرف وہ دیکھ رہی تھی' ادھر حد نظر تک سوائے اونچی نیچی ویران زمین اور جنگلی جھاڑیوں اور اکا دکا درختوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے سخت غصہ آیا کہ یہ عورت اب بھی اداکاری کر رہی ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک سمت ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے کہا۔

"ہمیں کولمبو لے چلو۔"

اب میں اپنا سر پکڑ لیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ یہ نارائنی یقیناً کوئی پاگل لڑکی تھی۔ میں خواہ مخواہ اس مصیبت میں الجھ گیا۔ بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کے ساتھ یہاں تک چلا آیا۔ کم بخت ٹیکسی والے کو یوں آہستہ سے بلا رہی تھی جیسے وہ اس کے قریب ہی خالی ٹیکسی لیے کھڑا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام رکھا تھا اور زمین کو حسرت و یاس کے عالم میں تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب یہاں سے پیدل ہی کولمبو تک سفر کرنا ہوگا کہ اچانک مجھے موٹر کے انجن کی آواز سنائی دی۔ مجھے جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور میں نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ جس طرف سے ہماری ٹیکسی آئی تھی بالکل اسی طرف سے ایک ٹیکسی ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ حیرت سے میرا منہ کھلا تھا اور ٹیکسی قریب آتی جا رہی تھی۔ نارائنی اب بھی اداس نظروں سے ٹیکسی کو تک رہی تھی۔ ٹیکسی قریب آ کر رک گئی۔ اسے ایک سنہالی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے انگریزی میں پوچھا۔

"تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے میری طرف دیکھ کر بیزاری سے کہا۔ "تم نے ہی تو بلایا ہے اتنی دور سے مجھے' جلدی بیٹھو' رات ہو رہی ہے۔"

میں اور نارائنی ٹیکسی کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی کولمبو شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سارا رستہ نہ ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی بات کی اور نہ نارائنی بولی۔ میں بھی خاموش تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی نارائنی ضرور ٹیلی پیتھی کی ماہر ہے اور اسی مقناطیسی علم سے کام لیتے ہوئے اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو وہاں بلا لیا ہے۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نارائنی جاتی کہاں ہے یعنی وہ کہاں رہتی ہے۔ جب ٹیکسی شہر میں داخل ہوئی تو نارائنی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں تمہیں بوریلا جنکشن پر اتار دوں گی۔"

میں نے اسے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ میں بوریلا جنکشن میں رہتا ہوں۔ لیکن اس قسم کی شعبدہ بازیاں وہ کرتی ہی رہتی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے میرے آفس ٹیلیفون کر کے میرا ایڈریس معلوم کیا ہو۔ میں اس کی رہائش گاہ کا پتہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے براہ راست اس سے پوچھ لیا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟"

نارائنی نے کہا۔ "ڈرائیور جانتا ہے میں کہاں رہتی ہوں۔"

"کیا مجھے نہیں بتاؤ گی؟" میں نے سوال کیا۔

نارائنی گردن گھما کر میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔ "تم جان کر کیا کرو گے؟ میں تو بہت جگہوں پر رہتی ہوں۔"

میں نے اس ذکر کو اسی جگہ ختم کر دینا ہی بہتر سمجھا اور کھڑکی میں سے باہر کولمبو کی عمارتوں کو دیکھنے لگا۔ نارائنی مجھے میری رہائش گاہ کے قریب چوک میں اتار کر چلی گئی۔

دو تین گزر گئے۔ میں نے قصداً نارائنی کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک اسرار پسند لڑکی ہے جو اپنے اس شوق میں حد سے گزر گئی ہے اور اپنی شعبدہ بازیوں سے مجھے پریشان کرنا چاہتی ہے۔ ایک ہفتے بعد اس کا فون آ گیا۔ میں ریڈیو سیلون کے ریکارڈ روم میں کام کر رہا تھا کہ صوبیدار پیارا سنگھ نے مجھے آ کر بتایا کہ کوئی لڑکی فون پر آپ کو بلا رہی ہے۔ یہ نارائنی تھی۔

"میں جانتی ہوں تم دفتر سے چار بجے چھٹی کرتے ہو' کیا تم پانچ بجے مجھے ملو گے؟ تم سے ایک ضروری کام ہے۔ میں سری رادھنا والے بودھ مندر کے پیچھے جو پرانے کھنڈر ہیں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا نارائنی نے فون بند کر دیا۔ وہ مجھے پھر کھنڈروں میں بلا رہی تھی۔ میں اب اس ڈرامے سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن نارائنی مجھے بار بار گھسیٹ رہی تھی۔ پہلے تو میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں سری رادھنا کے علاقے والے بودھ مندر کے کھنڈروں میں نہیں جاؤں گا لیکن جب ریڈیو سیلون سے رہائش گاہ پہنچا تو نارائنی کی شکل میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ میں نے اس کے خیال کو جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہر بار سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ اور پھر ایسا ہوا کہ میرے قدم اپنے آپ کولمبو کے اس علاقے کی طرف اٹھ گئے جدھر نارائنی نے مجھے بلایا تھا۔ یہ علاقہ شہر کے مشرقی کونے میں تھا۔ اور دو ایک بار ادھر سے میرا گزر ضرور ہوا تھا۔ وہاں ایک بودھ مندر بھی تھا۔ چھوٹے چھوٹے بودھ

مندر تو سارے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس بودھ مندر کے پیچھے پرانے کھنڈر تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ راون کے زمانے کے ہیں۔ میں بودھ مندر کے پیچھے ان بوسیدہ کھنڈروں میں پہنچ گیا۔ نارائی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک نارائی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آ گئی۔ اس نے میرے قریب آتے ہی پراسرار لہجے میں کہا۔

''میرے ساتھ آؤ' میں تمہیں ایک سانپ سے ملواتی ہوں۔''

سانپ اور سپیرا

سانپ کا نام سن کر قدرتی طور پر مجھے خوف محسوس ہوا۔

نارائی نے میری کیفیت کو بھانپ لیا اور بولی۔

''گھبراؤ نہیں' وہ سانپ تمہیں انسانی شکل میں ملے گا۔ آج سے سینکڑوں سال پہلے راون کے زمانے میں یہاں جنگل ہوا کرتا تھا۔ یہاں ایک قبیلہ تھا جو سانپوں کی پوجا کرتا تھا۔ یہ کھنڈر اسی زمانے کے سانپ مندر کے ہیں۔ جس سانپ سے میں تمہیں ملوانے جا رہی ہوں وہ اس مندر کا شیش ناگ ہے۔ وہ انسانی روپ میں آج بھی زندہ ہے۔ آؤ میں تمہیں اس سے ملاتی ہوں۔''

مجھے نارائی کی باتیں دیوانوں ایسی لگ رہی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آخر وہ مجھے کس خوشی میں اس سانپ نما انسان سے ملانا چاہتی ہے۔ کہنے لگی۔

''اسی لیے کہ تم آج سے سینکڑوں برس پہلے میرے مقتول خاوند کے دوست تھے۔ یہ سانپ بھی تمہیں جانتا ہے کیونکہ تم میرے خاوند کے ساتھ کبھی کبھی اس سانپ مندر میں آیا کرتے تھے۔''

میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''نارائی! مجھے تمہاری ان بے معنی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم مجھے خواہ مخواہ اپنے خود ساختہ ڈرامے میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ میں واپس جاتا ہوں۔''

میں واپس جانے لگا تو نارائی ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں پہلی بار اسے اس عاجزانہ موڈ میں دیکھ رہا تھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا تم نہیں چاہتے کہ میں جس آگ میں جل رہی ہوں اس سے نجات حاصل کر سکوں؟''

میں نے سٹپٹا کر کہا۔

''لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نارائنی! تم اس کھیل کو یہیں ختم کر دو تو بہتر ہے۔ تمہارا علاج صرف ایک ہی ہے کہ تم شادی کر کے اپنے خاوند کے ساتھ سکون کی زندگی گزارو۔''

نارائنی نے میرے دیکھتے دیکھتے اپنی قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا خنجر نکال لیا اور بولی۔

''سدھانتا! اگر تم نے میری مدد نہ کی تو میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے ہلاک کر ڈالوں گی۔''

میں جانتا تھا یہ سر پھری لڑکی ہے اور اس پر ایک خطرناک خود ساختہ بھوت سوار ہے۔ نارائنی نے خنجر کی نوک اپنی گردن میں تھوڑی سی چبھو رکھی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے خودکشی کر سکتی تھی۔ میں پردیس میں تھا اور قتل کے کیس میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''یہ کیا حماقت کر رہی ہو' خنجر پیچھے ہٹاؤ۔ چلو میں تمہارے شیش ناگ سے مل لیتا ہوں۔''

نارائنی کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ اس نے خنجر قمیض میں چھپا لیا اور بولی۔

''میں جانتی تھی تم ضرور میری مدد کرو گے۔ اس دنیا میں صرف تم ہی ایک ایسے آدمی ہو جو مجھے اس عذاب سے نجات دلا سکتے ہو۔ میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مجھے بوسیدہ دیوار کے پیچھے لے گئی۔ یہ غیر آباد ویران علاقہ تھا۔ جگہ جگہ تاڑ' ناریل اور کیلے کے درخت اگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ نچان میں درختوں کے نیچے مجھے ناریل کی چھت والی گپھا سی دکھائی دی۔ نارائنی نے گپھاہ کے پاس پہنچ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خود بھی گپھاہ کے دروازے کی ایک طرف ہو کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ گپھاہ کے دروازے پر ہرن کی کھال کا پردہ لٹک رہا تھا۔ نارائنی نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ جبکہ میں نارمل انداز میں سخت بوریت کے عالم میں بیٹھا تھا۔ نارائنی نے گپھاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شیش! میں آ گئی ہوں' سدھانتا بھی میرے ساتھ ہے۔''

میں دل میں نارائنی کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ یہ دیوانی عورت مجھے کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔ اس کی آواز پر گپھاہ کے باہر لٹکتا ہوا ہرن کی کھال کا پردہ ہٹا اور اندر سے کالے رنگ کا ایک دبلا پتلا آدمی باہر نکلا۔ اس کی آنکھیں سرخ انار کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے بال تھوڑے تھوڑے سفید ہو رہے تھے۔ اس

نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی جو اس کے گھٹنوں تک تھی۔ اس نے باہر آتے ہی سب سے پہلی میری طرف دیکھا اور بولا۔

''نارائی! یہ سدھانتا ہے' میں اسے جانتا ہوں۔ یہ میرے مندر میں تمہارے پتی دیو کے ساتھ آیا کرتا تھا۔''

میں نے دل میں کہا۔ کیا بیکار باتیں کر رہے ہو؟ تم سب فراڈ ہو اور خدا جانے کس مقصد کو سامنے رکھ کر تم لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہو۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ نارائی نے اس آدمی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ وشیش ہے یعنی ناگ دیوتا۔ یہ اس وقت انسانی روپ میں ہے۔ یہ سانپ کا روپ بھی بدل لیتا ہے۔''

تب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ نووارد اپنی پلکیں نہیں جھپک رہا تھا۔ میں یہ تسلیم کرنے پر کسی صورت میں بھی تیار نہیں تھا کہ یہ شخص سانپ ہے اور ڈیڑھ دو ہزار برس سے زندہ ہے۔ ممکن ہے اس نے آنکھیں نہ جھپکنے کی مشق کر رکھی ہو۔ بہرحال وہ مجھے بھی نارائی کے جھوٹے کھیل کا ایک کردار ہی لگ رہا تھا۔ وشیش نے نگاہیں مجھ پر جما رکھی تھیں۔ مجھ پر اس کی مقناطیسی نظروں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا کیونکہ میں بت پرست نہیں بت شکن تھا اور میرے دل میں خدا کے خوف کے سوا کسی کا خوف نہیں تھا۔ وشیش نے نارائی سے کہا۔

''نارائی! تمہارا پتی دیو سری لنکا میں پہنچ گیا ہے۔ مگر اس نے اس بار ایک سپیرے کا جنم لیا ہے اور اس کا نام رنگا ہے۔ وہ تمہیں نہیں پہچانے گا مگر اپنے دوست اور تمہارے ساتھی اس لڑکے کو پہچان لے گا جو سینکڑوں برس پہلے اس کا دوست سدھانتا تھا۔''

میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کم بخت کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنے والا ہے۔ وشیش ناگ کہہ رہا تھا۔

''تمہارے لیے اپنے پتی دیو کے قریب جانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ تمہارا یہ دوست تمہارے پتی رنگا سے جا کر ملے۔ وہ اسے فوراً پہچان لے گا۔ پھر اس کی مدد سے تم اپنے پتی دیو کے قریب رہ کر اپنے اس پاپ کا کفارہ ادا کر سکتی ہو جو تم نے اپنے پہلے جنم میں کیا تھا یعنی اپنے پتی دیو کو ناحق قتل کر ڈالا تھا۔''

نارائی نے پوچھا۔ ''مہاراج! میرا پتی دیو اس وقت کہاں ہوگا؟''

وہ کالا کلوٹا سرخ آنکھوں والا آدمی بولا۔ ''وہ شہر سے دور ڈنکامالی دریا کے کنارے تاڑ کے جنگل میں رہتا ہے۔ تم اپنے دوست کو اس کے پاس بھیجو۔ اس کے بعد تم خود سپیرن کے روپ میں اس سے ملاقات کرنا۔ آگے تمہیں کیا کرنا ہے یہ تم خود اچھی طرح سے جانتی ہو۔ اب میں جاتا ہوں۔ میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ لال لال سانپ ایسی آنکھوں والا کالا کلوٹا آدمی اٹھ کر واپس جھونپڑی میں چلا گیا۔ نارائی نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور

ہم بودھ مندر کی طرف چلنے لگے۔ میں ان دونوں کو فراڈ سمجھتے ہوئے دل میں کوس رہا تھا کہ نارائنی ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

''کیا تم میری مدد نہیں کرو گے؟'' کیا تم ایک گنہگار عورت کو اس عذاب سے نجات نہیں دلاؤ گے جو وہ سینکڑوں برس سے بھگت رہی ہے؟''

میں نے دل میں سوچا کہ اس رنگا نام کے بیرے سے مل کر معلوم کرنا چاہیے کہ وہ مجھے پہچانتا ہے کہ نہیں؟ ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ہوسکتا ہے وہ بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہو اور انہوں نے اسے میری کوئی تصویر دکھا رکھی ہو۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سارا ڈرامہ کس لیے رچایا جارہا ہے اور مجھے اس میں کیوں ملوث کیا جارہا ہے۔ ان لوگوں کو اور خاص طور پر نارائنی کو مجھ سے کیا غرض ہوسکتی تھی۔ اپنی تجسس پسند مہم جو طبیعت سے مغلوب ہو کر میں نے نارائنی کے آگے اس کے نام نہاد پتی دیو رنگا سے ملنے کی حامی بھر لی۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ نارائنی میرے حامی بھرنے پر بے حد خوش ہوئی جیسے اسے کوئی خفیہ خزانہ مل گیا ہو' کہنے لگی۔

''ڈنکا مالی دریا یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں ابھی تمہیں وہاں لیے چلتی ہوں۔ میں تم سے دور رہوں گی تم میرے پتی دیو سے جا کر ملنا۔ وہ تمہیں ضرور پہچان لے گا۔ میرے بارے میں تم اس سے کوئی بات نہ کرنا۔ کیونکہ اسے پچھلے جنم کی میرے بارے میں کوئی بات یاد نہیں ہوگی۔ اسے میری شکل بھی یاد نہیں رہی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ کسی پچھلے جنم میں راجہ راون کے خاندان کا ایک راجکمار تھا اور اس کی بیوی نے اسے قتل کر ڈالا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو پھر اسے میں کہاں اور کیسے یاد رہا ہوں گا؟''

نارائنی نے کہا۔

''اسے تمہارے بارے میں صرف اتنا ہی یاد ہے کہ تم کسی جنم میں اس کے دوست تھے۔ وہ کون سا جنم تھا اور تم دونوں کس ملک میں پیدا ہوئے تھے یہ باتیں اسے یاد نہیں ہوں گی۔''

میں نارائنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نارائنی نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور عاجزی سے بولی۔

''کیا تم میری اتنی سی مدد بھی نہیں کرو گے؟ اس دنیا میں صرف تم ہی میرا ایک سہارا ہو۔''

یہ بات آج تک میری بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ میں اس پراسرار لڑکی کی مدد پر ہر بار آمادہ کیوں ہو جاتا تھا۔ میں یہی تجزیہ کر سکا ہوں کہ اس میں میری اسرار پسندی اور مہم جوئی کا بھی کافی دخل تھا۔ بہر حال میں نارائنی کے نام نہاد خاوند سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا۔ نارائنی بڑی خوش ہوئی۔ ڈنکا مالی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ عین سڑک پر آ کر ہم نے ٹیکسی پکڑی اور شہر کے مشرقی علاقے میں پہنچ

گئے۔ یہاں ٹیکسی چھوڑ کر ہم درختوں اور قدرتی جھاڑیوں میں سے گزرتے دریا کی طرف چلنے لگے۔ یہ ایک چھوٹا سا دریا تھا جس کے کنارے اونچے اونچے اور سیاہ ڈھالوں والی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ نارائنی کی پراسرار تیز نظریں اس ویرانے میں اپنے خاوند کی جھونپڑی کو تلاش کر رہی تھیں۔ ہم ایک بلند سرسبز ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکلے تو نارائنی نے تاڑ کے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو! اسی جھونپڑی میں میرا پتی دیو رنگا رہتا ہے۔ میں اسی جگہ ٹھہرتی ہوں تم اس کے پاس جاؤ۔ تم یہ ظاہر کرنا کہ راستہ بھول کر ادھر آ نکلے ہو۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی پہچان لے گا۔ تم اس سے اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے واپس چلے آنا۔ میرے بارے میں ابھی اسے ایک لفظ بھی نہ بتانا' جاؤ۔''

میں اپنی مہم جوئی کی دھن میں نارائنی کو چٹان کی اوٹ میں چھوڑ کر تاڑ کے درختوں کے نیچے بنی ہوئی کی طرف بڑھا۔ یہ شک میرے دل میں یقین میں تبدیل ہو چکا تھا کہ نارائنی نے اس سپیرے کو پہلے ہی سے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا اور یہ سین بھی اس کے ڈرامے کا ایک حصہ ہی ہے۔ جھونپڑی بانس کی بنی ہوئی تھی۔ آگے تھوڑی سی جگہ صاف کر دی گئی تھی۔ ایک جانب مٹی کا ایک مٹکا رکھا تھا۔ جھونپڑی کے اندر سانپوں کی دو چار پٹاریاں پڑی تھیں مگر وہاں سپیرا کوئی نہیں تھا۔ میں ایک طرف کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں مجھے ایک طرف سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دراز قد سانولے رنگ کا خوبصورت جوان ایک ہاتھ میں سانپ کو دم سے پکڑے اسے آہستہ آہستہ جھٹکے دیتا چلا آ رہا تھا۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہیں بت سا بن کر مجھے تکنے لگا۔ پھر میری طرف لپک کر بولا۔

''میرے دوست سدھانتا! آخر تم مجھ سے مل ہی گئے۔ میں جانتا تھا کسی نہ کسی جنم میں تم سے ضرور ملاقات ہوگی۔''

میں پیچھے ہٹ گیا کیونکہ رنگا سپیرے کے ہاتھ میں زندہ سانپ تھا۔ اس نے سانپ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو! میں اسے پٹاری میں ڈال کر آتا ہوں۔''

وہ جھونپڑی میں گھس گیا۔ سانپ کو پٹاری میں بند کر کے باہر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ جب الگ ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''سدھانتا! بھگوان نے اسی جنم میں تجھ سے ملانا لکھا تھا۔ کیا تمہیں یاد نہیں آ رہا؟ ہم اسی ملک میں کسی زمانے میں رہا کرتے تھے۔ میں شاید ماہی گیر تھا اور تم میرے دوست تھے۔ ہم دونوں اس دریا میں مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا؟''

میں نے بھی اس ڈرامے میں اپنے آپ کو شریک کر لیا۔ میں نے کہا۔

''ہاں' مجھے یاد ہے۔ تمہارا نام شاید رنگا تھا۔''

رنگا سپیرا خوش ہو کر بولا۔

''یہی نام تھا میرا۔ بھگوان کا شکر ہے تمہیں میرا نام بھی یاد آ گیا۔ تب بھی میرا نام رنگا تھا اور اس جنم میں بھی میرا یہی نام ہے۔ تم کہاں ہوتے ہو؟ تم تو بڑے بدل گئے ہو۔ تم نے انگریزی لباس پہن لیا ہے۔ کیا تم سرکاری دفتر میں کام کرتے ہو؟''

میں نے اپنے بارے میں اسے واضح طور پر کچھ نہ بتایا۔ ویسے نارائنی کی ہدایت کے مطابق اس سے بھرپور دوستی اور خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں کل پھر کسی وقت اس سے ملنے آؤں گا اور بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ رنگا بولا۔

''میں تمہارا انتظار کروں گا۔ دن کے وقت میں جنگل میں سانپوں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔ اس وقت واپس آتا ہوں۔ تم اسی وقت آنا۔''

مجھ سے جدا ہوتے ہوئے وہ میرے گلے ملا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جیسے وہ مجھے سینکڑوں برس کے بعد دیکھ کر حیرت زدہ بھی ہو اور خوش بھی ہو۔

میں واپس نارائنی کے پاس آ گیا۔ وہ چٹان کی اوٹ میں بیٹھی میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے ساری باتیں بتا دیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر میرا بے حد شکریہ ادا کیا اور بولی۔

''کل تم اس سے میری بات کرنا۔ مگر اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں پچھلے جنم میں اس کی بیوی رہ چکی ہوں۔ تم کہنا کہ میں تمہاری دوست ہوں اور تمہارے دفتر میں کام کرتی ہوں اور مجھے سانپوں کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اس کے بعد میں سب خود ہی سنبھال لوں گی۔ میں کل ٹھیک چار بجے ٹیکسی لے کر تمہارے بوریلا جنکشن والے چوک میں پہنچ جاؤں گی۔ تم میرا انتظار کرنا۔''

نارائنی کا جامنی رنگت والا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ دریا کی طرف سے غروب آفتاب کے وقت ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی اور سورج ناریل کے درختوں کے پیچھے مغرب میں آہستہ آہستہ نیچے ہوتا جا رہا تھا۔

اور میں بے ہوش ہو گیا

نارائنی بڑی تیزی سے چکر لگا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس نے چار چکر پورے کر لیے۔ ہر چکر پر وہ اونچی آواز میں کہے جاتی تھی۔

''میں نے تمہارا اگنی زہر اپنے اوپر لے لیا۔''

نارائنی کو اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع شاید ہی ملتا۔ رنگا بوکھلا سا گیا۔ وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے رینگتے ہوئے نارائنی کو پکڑنے اور روکنے کی کوشش کی لیکن نارائنی نے اپنے دائرے کو زیادہ کشادہ کر دیا۔ میں بھی پرے ہٹ گیا تھا کہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ نارائنی نے ساتوں چکر پورے کر لیے تو وہ زمین پر گر پڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پہلے تو مجھے یہ سب کچھ ڈھونگ لگا لیکن دوسرے ہی لمحے نارائنی پانی پانی پکارتی دریا کی طرف بھاگی۔ رنگا سپیرے کے جسم کی تپش جیسے ایک دم ختم ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نارائنی کے پیچھے اسے آوازیں دیتا ہوا بھاگا۔ میں ایک طرف ہو کر یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ نارائنی نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے دیکھا کہ جہاں نارائنی دریا میں کودی تھی وہاں پانی میں سے بھاپ کے مرغولے اٹھنے شروع ہو گئے۔ رنگا سپیرے نے بھی اس کے پیچھے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

میں وہاں ایک پل کے لیے بھی نہیں رکنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نارائنی زندہ نہیں بچے گی۔ وہ اگنی سانپ کے زہر کو برداشت نہ کر سکے گی اور بہت جلد مر جائے گی اور میں اس کے قتل عمد یا خودکشی کا عینی گواہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں پلٹ کر بھاگ اٹھا۔ میں پکی سڑک پر آ کر تھوڑی دیر سانس لینے کو رکا اور پھر تیز تیز قدموں سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریلوے لائن کے پار چوک میں مجھے ٹیکسی مل گئی۔ گھر پہنچ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں خیر و عافیت کے ساتھ واپس آ گیا ہوں۔ میں نے نارائنی اور رنگا سپیرے کا خیال دل سے نکال دیا اور اس کا ذکر بھی کسی سے نہ کیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ پندرہ دن گزر گئے۔ اس دوران نہ تو میں دریا والی جھونپڑی کی طرف گیا اور نہ ہی نارائنی ہی مجھ سے ملی۔ اب میں ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے نارائنی کے کردار کو ایک وہم سمجھ کر دل و دماغ سے نکال دیا اور اپنے روزمرہ کے فرائض میں اپنے آپ کو محو کر دیا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ نارائنی مجھے کسی آسیبی کہانی کا کوئی ایسا کردار معلوم ہونے لگی تھی کہ جس سے کبھی خواب میں کسی پراسرار جنگل میں ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے بھی اب میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ نارائنی اپنے نام نہاد شوہر سے مل چکی تھی اور اسے بقول اس کے اپنے پچھلے جنم کے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ اب وہ جانے اور اس کا نام نہاد شوہر جانے۔

میں نے اپنی ساری توجہ اپنے ریڈیو سیلون کے ماحول کی طرف کر دی۔ میں اپنی ڈیوٹی پوری یکسوئی کے ساتھ ادا کرتا۔ میں نے فوجیوں کے لیے گیت مالا بھی لکھنی شروع کر دی۔ چھوٹے چھوٹے ریڈیائی مزاحیہ فیچر بھی لکھنے لگا۔ فوجی نوجوان انہیں بہت پسند کرتے اور ہمیں خط بھی لکھتے۔ ان ہی دنوں جنوبی ہند اور سیلون یعنی سری لنکا میں ایک تامل فلم کا بڑا چرچا تھا۔ یہ دھارمک فلم تھی اور اس کے گانے تامل پٹوں میں بڑے مقبول تھے۔ ہمیں اس فلم کے گانوں کے لیے تامل فوجیوں کی بڑی فرمائشیں آتی تھیں۔ اس فلم کی

مقبولیت کی وجہ سے اس کے ریکارڈوں کی جنوبی ہند اور سیلون میں بلیک ہوتی تھی۔ ہمیں دلی ریڈیو نے صرف تین ریکارڈ بھیجے تھے جبکہ اس فلم میں کل بارہ گانے تھے۔ دلی میں بھی یہ ریکارڈ نایاب تھے۔ ایک روز کیپٹن ملک نے مجھے کہا کہ تم جافنا جاؤ اور پراتھا اینڈ سنز والوں سے اس فلم کے باقی ریکارڈ بھی خرید لاؤ' مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس یہ ریکارڈ ضرور ہوں گے۔ جافنا میں احمد پراتھا والوں کی دکان میں ٹیلی فون نہیں تھا چنانچہ میرا جانا ضروری ہو گیا۔ اور میں ایک روز کولمبو سے ٹرین میں بیٹھ کر جافنا کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن شام کے وقت جافنا پہنچا۔ سیدھا ہوٹل میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے اور احمد پراتھا کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی شام کے چھ ہی بجے تھے لیکن میں یہ دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا کہ احمد پراتھا کی دکان پر تالا لگا تھا۔ اس نیک دل تامل مسلمان احمد پراتھا کا تعارف میں پہلے کروا چکا ہوں۔ جافنا شہر میں اس کی گراموفون ریکارڈوں کی دکان تھی۔ قریب ہی پرفضا بستی کے کونے میں اس کا چھوٹا سا لکڑی اور بانس کا بنا ہوا اپنا مکان تھا۔ جہاں وہ اپنی پابند صوم وصلوٰۃ بیوی اور نوعمر بیٹے عبدل پراتھا کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں نے سوچا' کہیں احمد صاحب بیمار نہ ہوں۔ ان کا گھر میں نے دیکھا ہوا تھا۔ ساتھ والے دکانداروں سے پوچھنے کی بجائے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ احمد پراتھا کے گھر چلا چلتا ہوں۔ تھوڑی چہل قدمی بھی ہو جائے گی۔ دو دن سے ٹرین میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں پیدل ہی احمد پراتھا کے مکان کی طرف چل پڑا۔ کیلے کے چھوٹے سے باغ میں سے گزر کر جب میں احمد صاحب کے مکان کے سامنے آیا تو وہاں مجھے کچھ عجیب نامانوس سی فضا چھائی ہوئی دکھائی دی۔ برآمدے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ صرف بیٹھک کی بتی جل رہی تھی۔ کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی واقعہ ہو گیا ہے۔ بیٹھک کا دروازہ بند تھا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی چڑھ کر زمین سے دو فٹ اونچی مچان پر بنے ہوئے لکڑی بانس کے اس مکان کے برآمدے میں آ گیا۔

میں نے آہستہ سے احمد پراتھا کا نام لے کر انہیں آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری بار پھر آواز دی۔ اس بار بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ اب مجھے تشویش ہوئی۔ میں دروازے کے پاس آیا اور محض تشویش کی وجہ سے بانس کے دروازے کی درزوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لکڑی کے فرش پر چٹائی بچھی ہے' چٹائی پر مصلیٰ بچھا ہوا ہے اور احمد پراتھا اور ان کی بیگم دونوں اپنے سروں کو ڈھانپے' ہاتھ سینے پر باندھے سر جھکائے بیٹھے عبادت میں محو ہیں۔ میں دبے پاؤں پیچھے ہٹ گیا۔ برآمدے سے اترا اور لکڑی کے شکستہ سٹول پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا کہ وہ عبادت سے فارغ ہوں تو میں انہیں ایک بار پھر آواز دوں۔

دس منٹ کے بعد احمد صاحب نے دروازے کا کیواڑ کھول کر دیکھا اور سنہالی میں پوچھا کہ کون صاحب ہیں۔ میں سٹول سے

اٹھ کر سامنے آ گیا۔ ادب سے احمد صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو لپک کر گلے لگا لیا۔ ''آپ کب آئے؟'' ان کی آواز میں نقاہت تھی اور لہجہ بجھا بجھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ضرور ہوا ہے۔ مجھے ان کا بیٹا عبدل پراتھا بھی وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے ابھرنے لگے۔ میں دل میں ان کی خیریت کی دعا مانگنے لگا۔ احمد صاحب تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے مجھے اندر لے گئے۔ ان کی بیگم مصلیٰ لپیٹ رہی تھیں۔ میں نے انہیں بھی جھک کر سلام کیا۔ وعلیکم السلام کہہ کر انہوں نے میری خیریت پوچھی۔ احمد صاحب کی بیگم کا لہجہ بھی اداس اور غمگین تھا۔ وہ مصلیٰ لے کر دوسرے کمرے میں جانے لگیں تو احمد صاحب نے آواز دے کر انہیں کھانا لانے کو کہا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ چائے میں ہوٹل سے پی کر آ رہا ہوں۔''

احمد پراتھا چٹائی پر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہوئے ان کے منہ سے آہ نکل گئی۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا کہ خیریت تو ہے احمد صاحب؟

انہوں نے میری طرف دیکھا' ذرا سا مسکرائے اور بولے۔

''بیٹا! تم ہمارے ساتھ کیوں پریشان ہوتے ہو۔۔۔۔۔۔۔ بتاؤ جافنا میں کیسے آنا ہوا؟ میرا خط مل گیا تھا؟''

''جی ہاں' باقی ریکارڈ بھی پہنچ گئے تھے لیکن خدا کے لیے مجھے بتایئے تو سہی کہ گھر پر اداسی کیوں چھائی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ عبدل کہاں ہے؟''

احمد صاحب نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا۔ ''وہی ہمارے پاس نہیں ہے۔''

میرے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔ ''کیا وہ۔۔۔۔۔۔۔؟'' اس سے آگے میری زبان جیسے بند ہو گئی۔

تب احمد پراتھا نے کہا۔

''بیٹا جو تم سمجھ رہے ہو وہ بات نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ عبدل بیٹا ابھی تک زندہ ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ زیادہ دن زندہ رہ سکے۔''

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ عبدل زندہ ہے' میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے پوچھا۔

''مجھے کھل کر بتایئے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

احمد پراتھا کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بوڑھے نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر تک دیوار پر لگے کیلنڈر کی طرف ٹکٹکی باندھے

دیکھتے رہے' پھر بولے۔

"میرے بیٹے کو میرے دشمن ہندو تامل اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ پچھلی بار احمد صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ جافنا اور پورٹ پیڈو کے متعصب ہندو تامل اس کے دشمن ہیں۔ وہ اس کے کاروبار کو تباہ کر کے اسے جافنا سے کولمبو کی طرف چلے جانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار وہ اس پر حملہ کر چکے تھے اور انہوں نے اسے کہہ رکھا تھا کہ اگر اپنی اور اپنے بیوی بچے کی زندگی عزیز ہے تو دکان بیچ کر یہاں سے کولمبو چلے جاؤ نہیں تو ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

"پرسوں دوپہر کو میرا بیٹا عبدل ایک ایجنٹ کے پاس نئے ریکارڈوں کا پتہ کرنے گیا اور تب سے واپس نہیں آیا۔ اسی روز شام کو مجھے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ تمہارے بیٹے کو ہم نے اغوا کر لیا ہے اور اب کبھی تم اس کی شکل نہیں دیکھ سکو گے۔"

احمد صاحب نے مجھے وہ خط نکال کر دکھایا۔ بادامی کاغذ پر تامل زبان میں لکھائی تھی۔ میں اسے پڑھ نہیں سکتا تھا۔ احمد صاحب نے مجھے خط پڑھ کر سنایا۔ میں نے پہلی بات انہیں یہ کہی کہ انہوں نے یہ خط پولیس کو دکھایا؟ احمد صاحب سانس بھر کر بولے۔

"یہاں کی پولیس بھی ہندو تامل ہے اور ہندوؤں سے ملی ہوئی ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے جانی دشمن ہیں اور انہیں پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ جو تامل ہندو شہر میں رہتے ہیں وہ بھی در پردہ ان کی مدد کرتے ہیں۔ ان میں ایک خفیہ گروہ ایسا بن گیا ہے جن کو یہاں کے امیر ہندو تاملوں کی مدد حاصل ہے۔ یہ گروہ مسلمانوں کو ایک ایک کر کے یہاں سے نکال دینا یا ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اور پھر خط میں مجھے یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر میں نے پولیس کو اطلاع کی تو میرے بچے کا کٹا ہوا سر میرے گھر میں بھیج دیا جائے گا۔"

احمد صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں سے آنسو چھلک پڑے۔ میرا دل ان کے غم میں بھر آیا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں اس ملک میں اجنبی تھا اور ایک فوجی ادارے سے وابستہ تھا۔ میں انہیں یہی مشورہ دے سکتا تھا کہ وہ قانون کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن وہاں ہندو تاملوں کی اکثریت تھی اور مسلمانوں کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ یہ مسلمانوں کے خلاف وہی مواد پک رہا تھا جو آج وہاں لاوا بن کر پھوٹ پڑا ہے اور لنکا کے مشرقی ساحل کے مسلمانوں کا وہاں تامل ہندوؤں اور بھارتی فوج کے ہاتھوں قتل عام کیا جا رہا ہے۔ میں نے انہیں حوصلہ دینے کی کوشش کی تو وہ صافے سے آنسو پونچھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولے۔

"ہماری قسمت میں جو لکھا ہے وہ تو ہمیں بھگتنا ہی ہوگا بیٹے تم بتاؤ' میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اور تم ہوٹل میں کیوں

ٹھہرے ہو یہاں کیوں نہیں آ گئے؟ یہ بھی تو تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ آپ کو اس آزمائش سے نکالے۔ مجھے حکم کریں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

احمد صاحب نے مجھے دعا دی اور آہ بھر کر رہ گئے۔ میں نے ریکارڈوں کی بات کرنی بالکل مناسب نہ سمجھی اور تھوڑی دیر بیٹھ کر ان سے اجازت طلب کی اور دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے اٹھ آیا۔ اس وقت شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں احمد صاحب کے مکان سے نکل کر کیلے کے چھوٹے باغ میں سے گزر کر ناریل کے درختوں والے چھوٹے سے راستے پر آیا تو مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک آدمی بھاگ کر درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے اسی میں خیریت جانی کہ اس علاقے سے نکل جاؤں۔ چنانچہ میں تیز تیز قدموں سے چلتا بڑی سڑک پر آ گیا۔ وہاں ایک رکشا خالی مل گیا۔ میں اس میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل آ گیا۔ دل میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ وہ آدمی کون تھا جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ دبلا کالا سا آدمی تھا۔ صرف دھوتی پہن رکھی تھی اور ایک چھلاوے کی طرح میرے پلٹنے کے ساتھ ہی دوڑ کر درختوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اس میں کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ احمد پراتھا صاحب کا گھر متعصب اور مسلمان دشمن ہندو تاملوں کا ٹارگٹ بن چکا تھا۔ قدرتی بات تھی کہ اس گروہ کے جاسوس اس گھر کی نگرانی کر رہے تھے۔

میں احتیاطاً رات کو بھی ہوٹل سے باہر نہ نکلا۔ کمرے میں ہی کھانا منگوا کر کھایا اور دروازہ اندر سے بند کر کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ میرے وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ معاملہ اتنی سنگین صورت اختیار کر جائے گا۔ تھوڑی دیر میں پلنگ پر لیٹا انگریزی رسالہ پڑھتا رہا جو میں کولمبو سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ کمرے کا پنکھا چل رہا تھا۔ نیند سے میری آنکھیں بھاری ہونے لگیں تو میں نے بتی بجھا دی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند پہلے ہی مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ مگر وہ کدھر سے آ گیا؟ دروازہ تو میں نے اندر سے بند کیا ہوا تھا۔ چٹخنی بھی لگا دی تھی۔ میں نے بتی جلا دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک انسانی شکل تیزی سے آگے بڑھتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی شے تھی۔ میرے سر پر ایک ضرب لگی۔ درد کی ایک تیز ٹیس میری رگ وپے میں اتر گئی اور اس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں کے نیچے پڑا ہوں۔ سر میں جہاں چوٹ لگی تھی ابھی تک درد ہو رہا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ چاروں طرف دیکھا' ناریل کے آڑے ترچھے درختوں کے سوا وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ایک جانب سمندر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تامل ہندو گروپ کے آدمی مجھے جافنا کے ہوٹل سے بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے اس ویران علاقے میں پھینک گئے تھے۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور کولمبو جافنا سے کتنی دور ہے۔ میں نے اپنی بش شرٹ اور پتلون کی جیبوں کو ٹٹولا۔ میرے سگریٹ ماچس میرے پاس ہی تھے مگر پیسہ نقدی نہیں تھی۔ میرا بریف کیس یا تو جافنا کے ہوٹل میں پڑا تھا اور یا پھر لوگ اسے بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی اشد ضرورت تھی کہ میں کس جگہ پر ہوں۔ میں اٹھ کر آہستہ آہستہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا آ رہی تھی۔ میری گھڑی بھی اتار لی گئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت دن کے دس گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تامل ہندو مجھے راتوں رات اٹھا کر اس جنگل میں پھینک گئے تھے۔ لیکن مجھے اس ویران علاقے میں پھینکنے سے ان کا مطلب کیا تھا؟ ایک بات بالکل واضح تھی کہ انہوں نے مجھے جافنا کے مسلمان ریکارڈ فروش احمد پراتھا کا ساتھی یا ہمدرد مسلمان سمجھ کر اغوا کیا تھا۔ احمد پراتھا کے بیٹے عبدل کو بھی یقیناً انہی لوگوں نے اغوا کیا ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ انہوں نے مجھے قید کیوں نہیں کیا۔ مجھے اس قسم کی دھمکی کیوں نہیں دی کہ میں احمد کے بیٹے کے معاملے میں دخل نہ دوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

سر کا درد آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگا تھا۔ میرا حلق پیاس کی وجہ سے خشک ہونے لگا۔ سمندر کی لہریں دور دور سے آ کر ساحل کی ریت کو چوم رہی تھیں لیکن میں سمندر کا پانی نہیں پی سکتا تھا۔ میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے کی بجائے درختوں کے اندر آ گیا۔ یہ سوچ کر کہ شاید جنگل میں کہیں کوئی ندی نالہ یا چشمہ مل جائے۔ کوئی ندی نالہ تو نہ ملا لیکن جنگل میں تھوڑی اندر جانے کے بعد زمین پر پڑے ہوئے ناریل مل گئے۔ انہیں توڑ کر ان کا پانی پیا' گری کھائی۔ بدن میں کچھ طاقت آئی تو آگے چل پڑا۔ دل میں یہ خیال بار بار آتا کہ ان لوگوں نے اگر مجھے یہاں لا پھینکا ہے تو ضرور یہ کوئی دور دراز اور ویران علاقہ ہوگا۔ جہاں سے واپسی آسان نہیں۔ میرا خیال تھا کہ جنگل کافی دور تک پھیلا ہوگا لیکن کوئی میل دو میل چلنے کے بعد سامنے سمندر آ گیا۔ کوئی ایک گھنٹے کی در بدری کے بعد میں نے یہ معلوم کیا یہ ایک بڑا چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ کوئی آبادی نہیں ہے۔ ناریل کے درخت بھی صرف مشرق کی جانب ہیں۔ باقی تینوں اطراف میں سیاہ اور بھوری بے آب و گیاہ چٹانیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کئی جگہوں پر میں نے سبز رنگ کے سانپ بھی گھاس سے نکل کر چٹانوں کی طرف جاتے دیکھے۔ ایک اعتبار سے یہ موت کا جزیرہ تھا۔ لنکا کے شمال اور مشرق میں اس قسم کے کتنے ہی جزیرے ہیں

ان میں کچھ جزیرے اتنے چھوٹے ہیں اور وہ اتنی دور سمندر میں واقع ہیں کہ وہاں کوئی آبادی نہیں۔ یہ جزیرہ بھی ایک ایسا ہی بے آباد ویران جزیرہ ہے۔ میں نے آدھے گھنٹے میں سارے جزیرے کا چکر لگا لیا۔

پھر تھک کر ساحل سمندر کے پاس ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ زمین کا رنگ سرخی مائل تھا۔ ریت پر گھونگھے اور سیپیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں یہ سوچ کر پریشان سا ہو گیا کہ یہاں میں زیادہ دیر تک ناریل کی خوراک پر زندہ نہیں رہ سکوں گا اور پھر کچھ پتہ نہیں کہ رات کو میں سو رہا ہوں اور کوئی سانپ یا بچھو مجھے کاٹ جائے۔ یہاں تو مجھے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔ مجھے کیپٹن ملک اور ریڈیو سیلون کے ساتھیوں کا خیال آنے لگا۔ کاش کسی طرح انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں یہاں جلاوطن کر دیا گیا ہوں۔ آخر میرا تعلق فوج سے ہے۔ فوج کا ہیلی کاپٹر مجھے ضرور یہاں سے نکال کر لے جاتا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس بے آباد جزیرے سے میں کولمبو اپنے ساتھیوں کو کیسے اطلاع کر سکتا تھا۔ ابھی تک تو مجھے وہاں کوئی جنگلی جانور یا درندہ نظر نہیں آیا تھا لیکن اگر رات کو کوئی درندہ حملہ کرتا ہے تو میرے پاس اپنے بچاؤ کے لیے ایک چاقو تک بھی نہیں تھا۔

کولمبو کے ساحل سمندر پر ناریل کے درخت مجھے بڑے رومانٹک لگتے تھے' لیکن وہ مجھے زہر لگ رہے تھے اور میں ان سے جتنی جلدی ہو سکے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دیس پردیس میں سفر کے دوران میں نے بہت صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ بستر سنجاب وسمور بھی میسر آئے اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے فٹ پاتھوں پر بھی راتیں گزاریں لیکن اس قسم کی جلاوطنی یا کسی ویران جزیرے میں پھینک دیئے جانے کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد مجھے پھر بھوک لگ گئی۔ دو تین ناریل توڑ کر کھائے اور سوچنے لگا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے مجھے کسی جگہ رات بسر کرنے کا ٹھکانہ بنا لینا چاہیے۔ کیونکہ مجھے نظر آ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے میں دور افتادہ ویران جزیرے سے نہیں نکل سکوں گا۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ایسا بے آباد جزیرہ میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ دو چار پرندے درختوں پر ضرور بول رہے تھے جیسے میرا منہ چڑا رہے ہوں کہ پھنس گئے ہو' اب یہاں سے نہیں نکل سکو گے۔ میں نے اٹھ کر درختوں کا جائزہ لیا۔ ناریل کے درخت پر رات بسر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ناریل کے علاوہ تاڑ کے درخت بھی تھے۔ وہ بھی ناریل ہی کی طرح اونچے لمبے تھے۔ صرف ان کی شاخیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے مہاراشٹر کا ایک جنگل یاد آ گیا جہاں مجھے ایک رات آدی باسیوں کے ہاں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انہوں نے رات کو تاڑی کے درخت کی ایک شاخ کاٹ کر اس کے منہ پر مٹی کی ہنڈیا باندھ دی۔ ہنڈیا کا منہ باریک کپڑے سے ڈھانپ دیا تھا۔ ساری رات تاڑی کا سفید سفید رس قطرہ قطرہ ہنڈیا میں گرتا رہا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہنڈیا اتار لی گئی۔ ہنڈیا تاڑی سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے بھی ایک کٹورا پیا۔

اس تاڑی کا ذائقہ دہی کی لسی کی طرح تھا۔ اس میں سے درختوں' جنگلوں اور پھولوں کی عجیب سی لطیف خوشبو آ رہی تھی۔ اس میں ابھی نشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ جنگل کے رہنے والوں نے مجھے بتایا کہ اگر سورج نکلنے کے بعد ایک گھنٹے تک ہانڈی تاڑ کے درخت سے لٹکی رہے تو اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہ اصلی تاڑی کی شراب یا مشروب بن جاتا ہے۔ رنگون کے ایک بازار میں تاڑی کی دکان تھی وہاں لکڑی کا بٹھل تاڑی سے بھرا ہوتا۔ مدراسی قورنگی (رکشا بان) باہر سڑک کنارے بیٹھ کر مٹی کے آبخوروں میں یہ تاڑی پی کر آپس میں خوب گالی گلوچ کرتے تھے۔ وہ تاڑی تاڑ کے درخت کی چھال سے بنائی جاتی تھی۔

میں بھوری اور سیاہ چٹانوں کے پاس آ گیا۔ یہاں بھی کوئے ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں رات بسر کر سکتا۔ ایک کھوہ ضرور نظر آیا مگر سانپ کا بچھو کا خطرہ تھا۔ اس لیے میں کسی درخت پر چڑھ کر سونا چاہتا تھا۔ درخت وہاں بہت کم تھے۔ میں چلتے چلتے جزیرے کے جنوبی ساحل کی طرف نکل آیا۔ یہاں مینگوشین کے دو درخت ساحل کے پاس ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ مینگوشین کا درخت ہمارے شیشم کے درخت کی طرح ہوتا ہے مگر شیشم جتنا گنجان نہیں ہوتا۔ زمین سے کوئی دس پندرہ فٹ تک اس کا تنا اوپر گیا ہوا تھا جہاں سے درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں دو شاخے اور سہ شاخے بھی تھے۔ یہ درخت رات بسر کرنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اب اس پر چڑھنے کا مرحلہ تھا۔ دوسرے درخت کے پیچھے ایک چھوٹا سا مٹی کا ڈبہ تھا جو درخت کے نصف تنے تک چلا گیا تھا۔ اس ٹبے پر سے میں کسی نہ کسی طرح درخت پر چڑھ گیا۔ درخت کی دوسری منزل پر ایک دو شاخے پر میں نے سونے کے لیے جگہ بنا لی اور پھر نیچے اتر آیا۔

ایک بار پھر میں نے جزیرے کا چکر لگایا۔ سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا چلنے کے باوجود فضا میں زبردست حبس تھا۔ ہوا بھی نیم گرم تھی کیونکہ سمندر پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بش شرٹ اتار کر کمر کے گرد باندھ لی۔ ساحل کی ریت پر کسی جگہ بھی انسانی پاؤں یا کسی کشتی کے گھسیٹنے کے نشان نہیں تھے۔ لگتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی مچھیرا اپنی کشتی لے کر نہیں آیا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہونے لگا۔ جزیرے پر اندھیرا اترنا شروع ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر زمین پر گرے ہوئے ناریل توڑ کر بھوک اور پیاس مٹائی۔ ناریل کوئی خوراک نہیں تھی لیکن اس وقت وہ مجھے دنیا کی بہترین ڈش معلوم ہو رہی تھی۔ جب جزیرے پر رات کا اندھیرا چھانے لگا تو میں مینگوشین کے درخت کے اوپر چڑھ کر دو شاخے پر اس طرح شاخوں میں ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا کہ اگر اونگھ آ جائے تو نیچے نہ گروں۔ میں نے اردگرد کی شاخوں کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ جونہی رات ہوئی' ایک نئی مصیبت نہیں حملہ کر دیا۔ یہ مچھر تھے۔ ٹراپیکل مچھر تھے۔ انہوں نے کاٹ کاٹ کر میرا برا حال کر دیا۔ میں سگریٹ سلگا کر دھواں ان پر پھینکتا لیکن یہ مچھر بھی شاید

سگریٹ پیتے تھے بڑے مزے سے سگریٹ کا دھواں نگلتے اور قہقہہ لگا کر پھر حملہ آور ہو جاتے۔ ہماری جنگ دیر تک جاری رہی۔ پھر وہ چلے گئے۔ شاید اس لیے کہ میرا کافی خون پی چکے تھے اور اب مزید خون پینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ چیونٹیاں بھی مجھے کاٹ رہی تھیں۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر شاخوں کو زور سے ہاتھ مار کر جھاڑ دیتا تھا۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر لمحے یہ ڈر لگا تھا کہ کسی طرف سے کوئی سانپ رینگتا ہوا نہ آ جائے۔ سانپ کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ بس دل میں خدا سے دعائیں مانگتا رہا۔



شاگالی

ابھی دن کی سنہری روشنی باقی تھی۔

کشتی اور قریب آئی تو میں یہ دیکھ کر حیران سا رہ گیا کہ اس میں ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ پیچھے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ لباس اور شکل صورت سے قبائلی لگ رہے تھے۔ ساحل پر پہنچتے ہی چاروں آدمی چھلانگیں لگا کر گھٹنے گھٹنے پانی میں اتر آئے اور کشتی کو گھسیٹتے ہوئے ریت پر لے آئے۔ انہوں نے عورت کو بازو سے پکڑ کر کشتی سے باہر نکالا اور کھینچتے ہوئے ساحل پر لا کر ایک جگہ اسے بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے کشتی میں سے رسیاں اور لکڑی کی میخیں لا کر وہاں رکھ دیں۔ میں متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ عورت دبلی پتلی اور گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ اس کے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس نے صرف ایک کرتی پہن رکھی تھی جو اس کی پنڈلیوں تک آتی تھی۔ عورت نے چہرہ اوپر اٹھا کر شاید ان سے رحم کی درخواست کی جس پر ایک قبائلی نے اسے زور سے تھپڑ مارا۔ عورت سر جھکا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ پھر انہوں نے عورت کے ہاتھ کھول دیئے۔ اچانک عورت اٹھی اور ایک طرف کو دوڑی۔ دو آدمیوں نے لپک کر اسے دبوچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے واپس لے آئے۔ وہ اپنی زبان میں اونچی اونچی آواز میں کچھ بول بھی رہے تھے۔ انہوں نے لکڑی کی میخیں گاڑیں اور عورت کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں ان میخوں کے ساتھ کس کر عورت کو ریت پر بالکل سیدھا لٹا دیا۔ چاروں ہاتھ پاؤں کی رسیاں باندھ کر ریت میں باندھ دیں۔ عورت تڑپ رہی تھی' کچھ بول رہی تھی مگر ان آدمیوں پر اس کی آہ و زاری کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں یہ گھناؤنا ڈرامہ درخت میں میں چھپا ہوا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا منظر میں نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھا ہو۔

عورت کو ریت پر اس طرح میخوں کے ساتھ جکڑ دیا گیا کہ وہ ہزار کوشش بھی کرتی تو اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکتی تھی۔ اس کے بعد چاروں آدمیوں نے جزیرے پر ایک نگاہ ڈالی اور کشتی کی طرف چلنے لگے۔ کشتی میں بیٹھے اور اسے پانی میں لے جا کر چپو چلاتے جدھر سے آئے تھے ادھر کو چل پڑے۔ جب تک ان کی کشتی مجھے نظر آتی رہی میں درخت میں ہی بیٹھا رہا۔ جب کشتی سمندر کی لہروں میں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ سورج اب سمندر کی سطح کو چھوڑ رہا تھا اور سمندر سے لے کر جزیرے تک ایک سنہری راستہ بن گیا۔ میں دوڑ کر عورت کے پاس گیا۔ عورت مجھے وحشت انگیز اور حیران نظروں سے تکنے لگی۔ میں نے اپنے

ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے ہاتھوں کی رسیاں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ رسیاں بڑی کس کر باندھی گئی تھیں۔ کافی جدوجہد کے بعد میں نے عورت کی دونوں کلائیاں کی رسیاں کھول ڈالیں۔ وہ ریت پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب اس کے دونوں ٹخنوں کی رسیاں کھولنی باقی تھیں۔ اس کام میں وہ میرے ساتھ شامل ہو گئی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور یہاں زندہ کیسے رہا۔ میں نے کہا' یہ باتیں بعد میں کروں گا۔

پاؤں کی رسیاں کھلنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سورج سمندر میں ڈوب چکا تھا اور شفق کی روشنی جزیرے پر آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ عورت کی عمر تیس کے قریب تھی۔ مضبوط اور صحت مند جسم تھا۔ آنکھیں سیاہ تھیں اور ماتھے پر دائیں جانب زخم کا نشان تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اپنی کلائیوں کو دباتی ذرا سا مسکرائی اور میرے ساتھ چل پڑی۔

اپنی پناہ گاہ یعنی مینگوشین کے درخت کے پاس آ کر میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہ لوگ اسے یوں باندھ کر کیوں چلے گئے تھے۔ عورت نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بلکہ شالی لنکا کے جنگلی قبیلوں کی ہندوستانی زبان میں مجھے جو کچھ بتایا وہ میں اپنے الفاظ میں آپ کو بتاتا ہوں۔

اس عورت کا نام شاگالی تھا۔ وہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع وہ ایک جزیرے میں رہتی تھی۔ اس کا خاوند چند روز ہوئے سمندر میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ قبیلے کی رسم کے مطابق خاوند کے مرنے کے چھ روز بعد اسے مگرمچھوں کے جزیرے پر اپنے خاوند کی آتما کو سورگ تک لے جانے کے لیے باندھ دیا گیا تھا تاکہ آدھی رات کو مگرمچھ اسے اپنا نوالہ بنالیں اور یوں وہ اپنے مرے ہوئے خاوند کی روح کو اپنے ساتھ اس قربانی کے بدلے بہشت میں لے جائے۔ شاگالی نے بتایا کہ ان کے جزیرے میں ہر عورت اپنے خاوند کے مرنے کے بعد مگرمچھ دیوتاؤں کی بھینٹ نہیں چڑھائی جاتی بلکہ یہ بدقسمتی صرف اس کے حصے میں آتی ہے جو بھارت کے کسی جزیرے یا گاؤں سے بیاہ کر وہاں لائی گئی ہو۔ شاگالی نے بتایا کہ وہ بھارت کے جنوبی شہر رامیشورم کے ایک سمندری گاؤں کی رہنے والی ہے جہاں اس کے ماتا پتا اور بہن بھائی اب بھی رہ رہے ہیں۔ انہیں اس کے خاوند کی موت سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ قبیلے والوں نے یہ احتیاط اس لیے برتی تھی کہ کہیں اس کے ماں باپ آ کر اپنی بیٹی کو واپس نہ لے جائیں جبکہ قبیلے والے اپنی رسم کے مطابق شاگالی کو مگرمچھوں کے حوالے کرنے والے تھے۔ اس کے بعد شاگالی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور اس موت کے جزیرے میں کیسے پہنچ گیا۔

میں نے بھی شاگالی کو اپنی داستان المختصر اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بیان کر دی۔ اس نے چاروں طرف ایک متوحش نگاہ ڈالی

اور بولی۔

''گھڑیال رات کو آتے ہیں' یہ لوگ اسے دیوتا مانتے ہیں' ہم انہیں دیوتا نہیں مانتے۔ہم ناگ دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ہم سانپوں کو دیوتا سمجھتے ہیں۔''

میں نے اسے بتایا کہ میں کئی راتوں سے مگرمچھوں کو جزیرے میں آکر ہڑبونگ مچاتے دیکھ رہا ہوں۔شاگالی نے حیرت سے پوچھا کہ میں زندہ کیسے بچا ہوا ہو۔تب میں نے اوپر درخت پر بنی ہوگی اپنی پناہ گاہ دکھائی۔اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہاں کھاتا کیا رہا ہوں؟میں نے انتہائی مایوسی کے ساتھ بتایا کہ صرف ناریل کی گری کھا کر اور اس کا پانی پی کر زندہ ہوں اور سخت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔میرے پیٹ میں بھی درد رہنے لگا ہے۔

وہ مجھے اپنے ساتھ چٹانوں میں لے گئی۔یہاں اس نے چھوٹی سی جھاڑی کے ساتھ لگا ہوا سبز امرود کی وضع کا پھل توڑ کر مجھے دیا اور بولی۔''اسے کھاؤ' یہ تمہاری بھوک مٹا دے گا۔پیٹ میں درد بھی نہیں ہوگا۔کمزوری بھی نہیں ہوگی۔''

پھل کا ذائقہ آملے کی طرح تھا۔میں کھا گیا۔اس کے کھانے سے میری طبیعت کچھ بشاش ہوگئی۔میں نے کہا۔

''رات ہو رہی ہے' ہمیں درخت پر چڑھ جانا چاہیے۔خونی مگرمچھوں کا کوئی بھروسہ نہیں کب سمندر سے نکل کر دندناتے ہوئے آجائیں۔''

ہم مینگوشین کے درخت پر چڑھ کر شاخوں میں بیٹھ گئے۔جب مچھروں اور چیونٹیوں نے حملہ کیا تو میں پریشان ہو کر کبھی مچھر اور کبھی چیونٹیاں مارنے لگا۔شاگالی نے فوراً اسی درخت کے کچھ پتے توڑ کر انہیں اپنی ہتھیلیوں میں زور سے مسلا اور پھر اپنے بازوؤں' گردن اور ٹانگوں پر ملنے لگی۔اس کے بعد بولی۔

''تم بھی ایسا ہی کرو' مچھر اور چیونٹیاں بھاگ جائیں گی۔''

میں نے بھی ایسا ہی کیا۔پتوں کے عرق کی خوشبو بڑی تیز تھی۔واقعی اس کے بعد نہ مچھر ہمارے قریب آیا اور نہ کسی چیونٹی نے ہماری طرف رخ کیا۔ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔میں نے شاگالی سے صرف ایک ہی بات پوچھی کہ ہم اس آدم خور جزیرے سے باہر کیسے نکل سکتے ہیں۔کیا تمہارے دماغ میں کوئی ترکیب ہے؟ مجھے تو کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی۔اس پر شاگالی ایک لمحے کے لیے چپ رہی۔جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔پھر کہنے لگی۔

''جب بیوہ عورت کو ہمارے قبیلے والے یہاں مگرمچھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو اس کے دو روز بعد ایک آدمی اس

جگہ ناریل توڑنے آتا ہے جہاں بیوہ عورت کو باندھا ہوتا ہے۔ اگر عورت وہاں نہ ہو تو وہ آدمی سمجھ جاتا ہے کہ مگر مچھ دیوتا اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ پھر وہ اس جگہ ناریل توڑ کر منتر پڑھتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔ یہ ایک ضروری رسم ہوتی ہے۔"

شاگالی نے یہ ساری بات اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں مجھے بتائی تھی۔ یہ زبان وہ اس لیے بول لیتی تھی کہ وہ رامیشورم کی رہنے والی تھی جو ہندوستان کی جنوبی تکون میں سمندر میں مشرق کی جانب ایک مشہور و معروف مذہبی مقام ہے جہاں چولا خاندان کے وقتوں کے پراچین مندر موجود ہیں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس ساری گفتگو میں ہمارے جزیرے سے نکلنے کا ذکر نہیں آیا تو وہ اپنی زبان میں بولی۔ (میں اس کے بیان کو اپنی زبان میں لکھتا ہوں)

"یہاں سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ جو آدمی ناریل توڑنے یہاں آئے گا ہم کسی طرح اس کی کشتی پر قبضہ کر لیں۔"

ترکیب بہت مناسب تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس آدمی کی کشتی پر قبضہ کیسے کیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس کے پاس نیزہ وغیرہ ضرور ہو گا۔ شاگالی نے کہا۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے کیا کرنا ہے میں خوب جانتی ہوں۔ بس کسی طرح آج اور کل کا دن ہمیں یہاں نکالنا ہو گا۔ پرسوں شام کے وقت وہ آدمی ناریل توڑنے آئے گا۔"

"تم اسے کس طرح قابو میں کرو گی؟ تم عورت ہو اور نہتی بھی ہو۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اس پر حملہ کر دوں۔"

شاگالی کہنے لگی۔ "یہ لوگ جنگلی ہیں۔ ان کی ساری زندگی دشمنوں سے مقابلے کرتی گزری ہے۔ تم ابھی اتنے طاقتور نہیں ہو کہ اس کا مقابلہ کر سکو۔"

میں نے فوراً کہا۔ "اور تم بھی تو اتنی طاقتور نہیں؟"

وہ بولی۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں چالاکی سے کام لے کر اس آدمی کو قابو کروں گی۔"

میں خاموش ہو گیا۔

آدھی رات کے وقت حسب معمول سمندر میں سے خونخوار مگرمچھوں کے جلوس نکل کر جزیرے میں دندنانے لگے۔ شاگالی جھک کر اندھیرے میں ان کی چمکتی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ تین مگرمچھ ہمارے درخت کے نیچے آ کر پھنکاریں مارنے لگے۔ شاگالی نے آہستہ سے کہا۔

"نہ جانے یہ خونخوار درندے کتنی معصوم عورتوں کو ہڑپ کر چکے ہیں۔"

مگر مچھ شور مچا رہے تھے' اودھم مچا رہے تھے' ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ جھاڑیوں سے نکل کر بھاگتے خرگوشوں اور لومڑوں کو پکڑ پکڑ کر ہڑپ کر رہے تھے۔ یہ بڑا رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا جس کو دیکھ دیکھ کر شاگالی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ آخر وہ بھی ایک وحشی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے اس وقت وہ بھی ایک خونخوار مگرمچھنی لگی جو عورت کا روپ بدل کر میرے پاس درخت کی شاخوں میں بیٹھی ہو۔

مگر مچھ شور شرابا مچا کر حسب معمول واپس چلے گئے۔ مجھے نیند آنے لگی۔ شاگالی نے کہا۔ "تم سو جاؤ میں جاگ رہی ہوں۔" میں نے درخت کی بڑی شاخ کے ساتھ اپنا سر لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرے کانوں میں شاگالی کے گنگنانے کی آواز آئی۔ وہ اپنے قبیلے کا کوئی سہانی لوک گیت گا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ شاگالی کی چمکیلی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ اس وقت مجھے وہ جادوگرنی لگی۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ شاگالی مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ پھر میرے کاندھے پر ہاتھ ہوئے بولی۔

"میں اپنے قبیلے کا ایک لوک گیت گنگنا رہی تھی۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاگالی گیت گنگناتی رہی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ مجھے لوری دے کر سلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں واقعی سو گیا۔

دوسرے روز ہم نے درخت سے اتر کو وہی امرود کی طرح کا پھل کھایا۔ ناریل بھی کھائے۔ شاگالی مجھے ایک چھوٹے سے قدرتی چشمے پر لے گئی۔ وہ پانی کی خوشبو سونگھتی ہوئی مجھے وہاں لے گئی تھی۔ پتھروں کے درمیان پانی کی ایک لکیر سی نیچے بہہ رہی تھی۔ ہم نے سیر ہو پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ تازہ دم ہو کر واپس ساحل سمندر پر آ گئے۔ سمندر کے کنارے ریت پر مگر مچھوں کے پنجوں اور پیٹ کے بل گھٹنے کے نشان ابھی سمندر کی لہروں نے پوری طرح سے صاف نہیں کئے تھے۔ مگر مچھوں نے ان میخوں کو بھی اکھاڑ دیا تھا جس کے ساتھ چار آدمی شاگالی کو باندھ گئے تھے۔ شاگالی بولی۔

"یہ اچھی بات ہے وہ جو آدمی یہاں آئے گا اسے ان میخوں کو دیکھ کر یقین ہو جائے گا کہ مگر مچھ مجھے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

سارا دن ہم جزیرے میں ادھر ادھر پھرتے رہے۔ رات آ گئی تو درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر باری باری نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ اس سے اگلا دن اور اگلی رات بھی اسی طرح گزر گئی۔ اب وہ شام آ گئی جب شاگالی کے بیان کے مطابق قبیلے کے خاص کاہن یا پجاری قسم کے آدمی نے کشتی لے کر وہاں ناریل توڑنے آنا تھا۔ شاگالی نے کہا۔

"تم درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاؤ' وہ آ رہا ہوگا۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت ایک مرد کو کیسے قابو میں کرے گی۔ جب میں نے اپنے اس وسوسے کو ظاہر کیا تو وہ کہنے لگی۔

"یہ تم درخت پر بیٹھے دیکھتے جانا۔ ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

میں درخت پر چڑھ گیا اور شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے مجھے ساحل سمندر کی وہ جگہ صاف نظر آ رہی تھی جہاں ابھی تک تین لکڑی کی میخیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ شاگالی ایک درخت کی اوٹ میں ہوگئی۔ سورج مغرب کی جانب سمندر میں جھکنے لگا تھا۔ میری نظریں سطح سمندر پر لگی تھیں۔ اچانک وہاں ایک دھبہ نمودار ہوا جو ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاگالی نے ٹھیک کہا تھا یہ کشتی ہی تھی۔ کشتی ذرا قریب آئی تو واقعی اس میں ایک آدمی سوار تھا۔ وہ کشتی کے چپو چلاتا اسے ساحل کی طرف لیے آ رہا تھا۔ ساحل پر آ کر اس نے کشتی سے اتر کر اسے ریت پر کھینچ لیا۔ یہ کشتی پہلے والی کشتی سے چھوٹی تھی اور صرف دو آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے ہی تھی۔ یہ انہی چار آدمیوں کے قبیلے کا جنگلی قبائلی ہی تھا۔ کشتی میں سے اس نے ایک چھوٹی سی ٹوکری نکالی۔ اس میں تین ناریل ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر رسی سے جکڑ دیئے گئے تھے۔ اس ٹوکری کو لے کر وہ اس جگہ آیا جہاں اس کے آدمی شاگالی کو باندھ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ آدمی اس سے پہلے بھی کئی بیوہ عورتوں کو یہاں مگرمچھوں کے حوالے کے بعد ان کے لیے ناریل توڑ چکا تھا۔ اس نے جھک کر ریت میں دھنسی ہوئی میخوں اور رسی کو دیکھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر وہاں ماتھا ٹیکا اور تینوں ناریل ٹوکری میں سے نکال کر ریت پر رکھ دیئے۔ اب وہ ہاتھ باندھے آنکھیں بند کئے اونچی آواز میں سنہالی اشلوک پڑھنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ جھوم جھوم کر اشلوک پڑھ رہا تھا۔ میں چونک پڑا۔ شاگالی درخت کی اوٹ سے نکل کر اس آدمی کو عقب کی جانب سے آگے بڑھ رہی تھی۔ شاگالی نے دونوں ہاتھوں میں ایک بھاری پتھر اٹھا رکھا تھا۔

وہ دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔

جنگلی پجاری آنکھیں بند کئے اونچی آواز میں اشلوک پڑھے جا رہا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ موت دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں دیکھ ہی رہا تھا کہ شاگالی نے ایک دم سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر پتھر جنگلی آدمی کے سر پر دے مارا۔ اشلوک کی آواز بیچ میں سے ہی ٹوٹ گئی اور وہ منہ کے بل آگے کو لڑھک گیا۔ شاگالی نے ایک بار پھر پوری طاقت سے پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ مجھے خون کی دھار بہتی دور سے دکھائی دی۔ شاگالی پیچھے ہٹ گئی۔ پھر اس نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ میں درخت سے اتر کر ڈرتا ڈرتا اس کے پاس گیا۔ یہ عورت شاگالی سچ مچ جنگلی عورت تھی اور اب تو وہ ایک خونی عورت بھی تھی۔ جنگلی پجاری کا بھیجہ باہر

نکل آیا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ اس کا منہ سر خون میں لت پت تھا۔ شاگالی نے کہا۔

''لاش کو یہیں پڑے رہنے دو رات کو مگر مچھ اس کے دیوتا ماموں آ کر خود ہی اسے ہڑپ کر جائیں گے۔''

جنگل کے اندر چشمے پر جا کر شاگالی نے ہاتھ صاف کئے' پانی پیا۔ میں ایک طرف پتھروں پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنی فراک نما کرتی سے منہ پونچھتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''اب ہمیں پندرہ بیس ناریل اور سبز جنگلی پھل توڑ کر درخت کے نیچے رکھ دینے ہوں گے۔ ہم صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے سمندری راستہ کا پتہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہ بولی۔

''میں نے انہی سمندروں میں آنکھ کھولی ہے۔ یہاں سے ہم شمال مغرب کی طرف چلیں گے۔ جنوب میں پچاس میل پر میرے خونی سسرال والوں کا جزیرہ ہے لیکن شمال مغرب میں ساٹھ ستر میل پر انڈیا کا ساحل ہے' ہم انڈیا کے ساحل پر رامیشورم کی طرف سے جا پہنچنے کی کوشش کریں گے۔''

میں نے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ہماری کشتی چھوٹی ہے' سمندری لہریں ہمیں اٹھا کر کہیں سے کہیں لے جائیں گی۔ میرا نہیں خیال کہ ہم رامیشورم پہنچ سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم لنکا ہی کے بڑے جزیرے کی طرف چلتے ہیں۔ جافنا پہنچ کر تم باقاعدہ سٹیمر جہاز کے ذریعے رامیشورم پہنچ جانا۔''

اس پر شاگالی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سیاہ بالوں میں سے ناریل کی گہری خوشبو آ رہی تھی۔ میری طرف گھورتے ہوئے بولی۔

''تم کیسے مرد ہو' سمندر سے ڈرتے ہو۔ جو لوگ سمندر سے ڈرتے ہیں' سمندر انہیں جہاں بھی وہ ہوں آ کر پکڑ لیتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ایک ہی دن میں رامیشورم پہنچا دوں گی۔ سمندر میں دوپہر کے وقت ایک خاص گرم رو چلتی ہے جس کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے۔ یہ رو دوپہر کے بعد جنوب سے شمال کی طرف چلا کرتی ہے۔ اگر میں اس رو پر کشتی ڈالنے میں کامیاب ہو گئی تو ہم آدھے وقت میں انڈیا کے ساحل پر پہنچ جائیں گے۔''

رات کو ہم درخت پر ہی سو گئے۔ آدھی رات کو مگرمچھوں کے ہڑبونگ مچانے سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ ساحل پر مگرمچھ آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ شاگالی نے کہا۔ ''وہ پجاری کی لاش نوچ رہے ہیں۔ باقی ساری رات ہم نے جاگ کر گزاری۔ پو پھٹتے ہی ہم

درخت سے اتر آئے۔ جتنے ناریل وغیرہ ہم نے درخت کے نیچے جمع کر رکھے تھے وہ اٹھا کر کشتی میں رکھ دیئے۔ پجاری کی لاش کہیں نہیں تھی۔ مگر مچھ اس کی تکا بوٹی کر کے ہڑپ کر چکے تھے۔ میں نے سمندر کو دیکھا۔ رات کے پچھلے پہر کے نیم اندھیرے میں سمندر سے خوف آتا تھا۔ حدنگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی کشتی پر نظر ڈالی تو مجھے یقین سا ہونے لگا کہ یہ کشتی ہمیں بیچ سمندر میں ڈبو دے گی۔

شاگالی بڑی پر جوش تھی۔ جلدی جلدی اس نے ناریل وغیرہ کشتی کے درمیان میں پھیلا دیئے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

''آ جاؤ' کھلے سمندر تک ہمیں چپو چلانے پڑیں گے اس کے بعد میں تیز رفتار رو پر کشتی کو ڈالنے کی کوشش کروں گی۔''

اس آدم خور جزیرے سے نکلنا بھی ضروری تھا۔ ہاں بھی سوائے موت کے اور کوئی انجام دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ چپوؤں کی مدد سے ہم کشتی کو سمندری لہروں کے اوپر سے نکال کر بیچھے سمندر میں لے گئے۔ سمندر کی لہروں کی آواز اب بڑے قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ کشتی سے ٹکرا کر لہریں جھاگ اڑاتیں۔ شاگالی بڑی مہارت اور چوکسی کے ساتھ چپو چلا رہی تھی۔ میں اس کی نقل کرتے ہوئے بالکل ویسے ہی چپو چلا رہا تھا۔ سمندر میں کشتی چلانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

دو پہر ہو گئی تو شاگالی نے چپو چلانا چھوڑ دیئے۔ ہماری کشتی اپنے آپ مغرب کی طرف ہی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا ہم طوفانی لہر پر جا رہے ہیں؟''

شاگالی نے ناریل توڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں' وہ لہر ابھی تک مجھے نظر نہیں آئی شاید کچھ دور جانے کے بعد مل جائے۔۔۔۔۔۔ یہ لو تم بھی ناریل لو۔''

ناریل توڑ کر ہم نے اس کا تازہ اور میٹھا پانی پیا' گری کھائی۔ مجھے یہ گری زہر لگنے لگی تھی۔ کبھی گری والے بسکٹ یا ٹکیاں ہم بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے لیکن اب اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ سارا دن ہماری کشتی سمندر میں ایک خاص رخ پر سفر کرتی رہی۔

پھر کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں کے قریب سے ہماری کشتی گزری۔ اس کے بعد ہم ایک بار پھر کھلے سمندر میں آ گئے۔ اس دوران ہم کتنے ہی ناریل توڑ کر انہیں با دل نخواستہ کھا چکے تھے۔ مجھے کولمبو والا مسز جونز کا خوبصورت بنگلہ یاد آ رہا تھا جہاں میرا ایک آرام دہ کمرہ تھا۔ یقیناً یہ سب لوگ میرے لیے پریشان ہوں گے لیکن میرے پاس ان کو اطلاع پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

سورج غروب ہوا تو سمندر پر کافی دیر تک شام کی روشنی باقی رہی۔ اس کے بعد جب رات کا اندھیرا چھایا تو میں نے کچھ نا امید سا ہو کر شاگالی سے کہا کہ کہیں ہم راستہ بھول تو نہیں گئے۔ وہ چپو چلاتے ہوئے جدھر سورج غروب ہوا تھا' اس طرف دیکھ رہی تھی' کہنے

لگی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔"

کوئی آدھ گھنٹے بعد دور سمندر کی تاریکی میں ستارہ سا جھلملانے لگا۔ شگالی نے کہا۔ "یہ رامیشورم کا لائٹ ہاؤس ہے۔"

رتنا گری

کیرالہ کی رہنے والی رتنا گری خوب عورت تھی۔

صوبیدار پیارا سنگھ اس پر لٹو ہو گیا۔ رات کو گانے بجانے کے پروگرام میں وہ ترنگ میں آ کر رتنا گری کے ساتھ اٹھ کر بے ہنگم ڈانس کرتا رہا۔ اس بات کا کسی نے خاص نوٹس نہ لیا۔ وہ پروگرام ہی انڈین فوجیوں کو خوش کرنے کے لیے تھا لیکن دوسرے دن جب صوبیدار پیارا سنگھ دوپہر کے وقت آدھی بوتل چڑھا کر رتنا گری کی بیرکس میں پہنچ گیا تو وہاں ایک تہلکہ سا مچ گیا بلکہ پیارا سنگھ نے جاتے ہی تہلکہ مچا دیا۔ یونٹ کمانڈر کی طرف سے رتنا گری اور اس کی ایف ڈی ایس پارٹی کے دوسرے مدراسی اور بنگالی گانے بجانے والوں کو کولمبو شہر کے مغربی علاقے میں ساحل سمندر کے پاس شوگان بیرکس میں چار کمرے دے دیئے گئے تھے۔ یہ ایک پرانی فوجی بیرک تھی جہاں ایم ٹی کے کچھ لوگ رہتے تھے۔ باقی بارکوں میں بیکار فوجی سامان بھرا ہوا تھا۔

صوبیدار پیارا سنگھ جب وہاں پہنچا تو وہ لوگ ساری رات گانے بجانے کا پروگرام کرنے کے بعد ابھی تک آرام کر رہے تھے۔ رقاصہ اور مغنیہ یعنی کیرالہ کی شعلہ جوالہ مس رتنا گری بھی سو رہی تھی۔ صوبیدار پیارا سنگھ نے بیرکس کے ورانڈے میں جاتے ہی ایف ڈی پارٹی کے ہندو مدراسی سربراہ راما کٹی کو آواز دی۔ ابھی پیارا سنگھ اپنے ہوش و حواس میں تھا' آدھی بوتل نے ابھی اس کا کچھ زیادہ نقصان نہیں کیا تھا۔ راما کٹی ایک ہاتھ سے دھوتی سنبھالتا اور دوسرے ہاتھ سے آنکھیں ملتا بیرک سے باہر نکل آیا۔ سامنے پیارا سنگھ کو فوجی وردی میں دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہی شخص جو رات کو رتنا گری کے ساتھ اٹھ کر ناچنے لگا تھا۔ رتنا گری کے تیر نگاہ کا نشانہ بن گیا ہے۔ اس سے مال بٹورنا چاہیے۔ یہ وہ کھیل تھا جو پارٹی کا سربراہ تجربہ کار راما کٹی جب سے پارٹی قائم ہوئی تھی کھیلتا چلا آ رہا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس بار اس کا پالا پیارا سنگھ سے پڑ گیا ہے۔ ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا اور بولا۔

"آیئے سردار جی' مگر ابھی تو سب لوگ آرام کر رہے ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہے ہمارا کام ہی ایسا ہے راتوں کو گانا بجانا کرتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں۔

پیارا سنگھ نے گھور کر ناٹے قد کے کالے کلوٹے مدراسی ہندو کو دیکھا ہاتھ جوڑ کر نمسکار کا جواب دیا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں' میں

بیٹھ جاتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں سردار جی' آپ میری بیرک میں آ جائیں میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔"

باقی آدھی بوتل پیارا سنگھ ساتھ ہی لیتا گیا تھا بیرک میں بیٹھتے ہی اس نے اسے نکال کر میز پر رکھا تو مدراسی راما کٹی کی جان ہوا ہو گئی۔ اس آدمی کو چڑھ گئی تو یہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔ تجربہ کار تھا صوبیدار پیارا سنگھ کو کرسی پر بٹھا کر چائے لینے کے بہانے باہر نکلا اور سیدھا بیرکس کے مدراسی حوالدار چوکیدار کو جا کر اپنا دکھڑا سنایا کہ بھائی میری مدد کرو۔ اس نے کہا۔

"دادا بھائی' میں حوالدار ہوں وہ صوبیدار ہے' میرا رینک چھوٹا ہے میں اسے بیرکس سے نہیں نکال سکتا۔"

مدراسی حوالدار نے فوراً کمپنی کمانڈر کو جو مرہٹہ کیپٹن تھا فون کر دیا۔ مرہٹہ کیپٹن نے کہا۔ "فکر نہ کرو میں گارڈ بھیج رہا ہوں۔"

راما کٹی رام رام کرتا واپس اپنی بیرک میں آیا تو صوبیدار پیارا سنگھ اپنے فل موڈ میں تھا اور گردن دائیں بائیں مارتا ہوا میز پر ہاتھ سے طبلہ بجا رہا تھا۔ راما کٹی کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو کر غرایا۔

"کتھے ای ساڈی بسنت کور؟"

راما کٹی کو سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ ہاتھ جوڑ کر یونہی بتیسی نکالے کھڑا رہا۔ پیارا سنگھ نے خالی بوتل اٹھا کر زور سے دیوار پر دے ماری اور ایک چھناکے سے بوتل کرچی کرچی ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے ایک بھڑک لگائی۔ بیرکس میں شور مچ گیا۔ ایف ڈی پارٹی کے دوسرے چھوٹے چھوٹے کالے کالے مدراسی سازندے وغیرہ گھبرا کر باہر نکل آئے۔ انہوں نے ایک مست ہاتھی کو جھومتے گرجتے دیکھا تو واپس بیرکوں میں بھاگ گئے۔ مس رتنا گری کی بھی اس شور کی وجہ سے آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ بالوں کو سنوارتی کچھ پریشان پریشان سی اپنی بیرک سے باہر آئی تو پیارا سنگھ اسے دیکھتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ اس نے پنجابی کے شعر پڑھنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ راما کٹی نے دور سے مدراسی زبان میں چیخ کر رتنا گری سے کچھ کہا' رتنا گری جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لی۔ پیارا سنگھ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بھڑکیں مار رہا تھا۔ عین اس وقت فوجی جیپ وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے انڈین گارڈ کے سپاہی چھلانگیں لگا کر اترے اور انہوں نے صوبیدار پیارا سنگھ کو قابو کر لیا۔ پیارا سنگھ گوریلا بن گیا مگر فوجیوں نے اسے اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور وہاں سے لے گئے۔

پاکستان کے قیام کا اعلان

پاکستان کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

ریڈیو سیلون کے مسلمان سٹاف کو قیام پاکستان سے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ سٹاف کے ہندو ممبروں کے چہرے اتر گئے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی ایک الگ مملکت قائم ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مگر پاکستان بن گیا تھا۔ ہندوستان سے مسلم کش فسادات کی تشویش ناک خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ دلی ہیڈ کوارٹر سے حکم آیا کہ ریڈیو سیلون کے مسلم سٹاف سے پوچھا جائے کہ وہ ہندوستان واپس آنا چاہتے ہیں کہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ ریڈیو سیلون کے مسلمان سٹاف میں ایک صوبیدار بوستان خان تھا۔ ایک ہمارے انچارج کیپٹن ممتاز ملک تھے۔ ہم نے لکھ بھیج دیا کہ ہم پاکستان جانا چاہتے ہیں۔

ملک صاحب مجھے اپنے ساتھ ہی کولمبو کی بندرگاہ سے کراچی لے جانا چاہتے تھے مگر مجھے ٹرین میں سفر کرنے کا شوق تھا۔ اگست کے دن تھے۔ میں ٹرین میں سفر کرتے ہوئے لنکا' جنوبی ہند' مدھیہ پردیش اور اتر پردیش' بیجاپور' ناگپور' میرٹھ انبالہ کی بارشیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے ان سنگین حالات کا اندازہ نہیں تھا جن میں سے شمالی ہند خاص طور پر پنجاب گزر رہا تھا۔ فسادات کی پوری خبریں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ لنکا کے اخبار فسادات کی خبریں تفصیل سے نہیں دیتے تھے۔ ریڈیو پر ان خبروں کو اچھالنے کی پالیسی نہیں تھی۔ کیپٹن ملک نے مجھے منع بھی کیا کہ میں بذریعہ ٹرین سفر کرنے کا ارادہ تبدیل کر کے ان کے ساتھ بذریعہ بحری جہاز کولمبو سے کراچی چلوں لیکن وہ واپس جاتے ہوئے ایک بار پھر لنکا کے جنگلوں میں گرتی طوفانی بارشوں اور نربدا اور تاپتی دریاؤں کی سرخ چٹانوں والے کناروں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا۔

چنانچہ پہلے میں کولمبو سے دلی کی طرف روانہ ہوا۔ میرا ٹکٹ کولمبو سے امرتسر تک کا بنایا گیا تھا۔ کولمبو کے فورٹ اسٹیشن سے میں چھوٹی لائن کی کاریڈور والی سبز رنگ کی ٹرین کے سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گیا۔ لیفٹیننٹ صدیقی مجھے چھوڑنے اسٹیشن پر میرے دوسرے دوستوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ حسب معمول پائپ پی رہے تھے۔ جب ٹرین چلنے لگی تو میرا ہاتھ گرم جوشی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔

''اپنا خیال رکھنا دوست اور مجھے کراچی کے پتے پر خط ضرور لکھنا۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ تم ریل کے ذریعے سفر کرو۔ پنجاب میں حالات بڑے خراب ہیں لیکن تمہارے بارشوں اور جنگلوں کو دیکھنے کے شوق کو دیکھتے ہوئے میں بھی چپ رہا۔''

میں نے کہا۔ ''صدیقی بھائی' اللہ مالک ہے۔ خدا جانے پھر کب ان گھنے جنگلوں میں سے گزرنا نصیب ہو۔ یہ جنگل بھی مجھے آخری بار دیکھنا چاہتے ہیں۔''

الوداع کولمبو!

کولمبو اسٹیشن سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بارش شروع ہوگئی۔ آسمان پر دو دن سے ابر چھایا ہوا تھا اور وقفے وقفے سے بوندا باندی جاری تھی۔ میرے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ میں نے کبھی سامان ساتھ لے کر سفر نہیں کیا۔ یہ میری خانہ بدوشانہ آوارہ گردی کے باعث بھی تھا۔ کیونکہ میں کہیں کسی اسٹیشن پر اپنا سفر ختم کر دیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت میری منزل میرا اپنا شہر امرتسر ہی تھا۔ اور دل میں کچھ کچھ گھر والوں کی فکر ضرور لگی تھی کہ وہ خیریت سے ہوں ۔۔۔۔۔۔ لیکن امرتسر سے ہزاروں میل دور ہونے کی وجہ سے مجھے حالات کی سنگینی کا بالکل احساس نہیں تھا۔ میں بارش اور کولمبو کے مضافات کے درختوں اور سرسبز کناروں والی سبز جھیلوں کا لطف اٹھا رہا تھا۔

بارش کی پھوار ڈبے کے اندر آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ بڑا اسٹیشن آتا تو ٹرین تھوڑی دیر کے لیے رکتی اور پھر آگے چل پڑتی۔ لنکا کی شمال مغربی بندرگاہ ٹالی منار تھا' یہ ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔

لنکا کے وسطی علاقوں کے جنگل دوپہر کے بعد شروع ہو گئے تھے۔ بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ یہ اتنے گھنے' پراسرار اور گہرے جنگل تھے کہ آج انہیں یاد کرتا ہوں تو دل بے اختیار اڑ کر ان کے پاس جانے کو چاہتا ہے۔ شہروں کے مقابلے میں جنگلوں نے ہمیشہ مجھے اپنی طرف کھینچا ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ شہروں میں جو تصنع اور بناوٹ ہوتی ہے جنگل اس سے عاری ہوتے ہیں۔

یہ ٹرین سیدھی ٹالی مینار تک جاتی تھی۔ جب ٹرین رات کے گہرے اندھیرے میں شمالی لنکا کے پراسرار جنگلوں میں سے گزر رہی تھی تو مجھے بند کھڑکی کے شیشے پر ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دی۔ میں بارش کی آواز سننے کے لیے پہلے ہی سے ہمہ تن گوش تھا۔ جونہی کھڑکی کے شیشے پر بارش نے دستک دی میں نے شیشہ چڑھا دیا۔ ساری رات ٹرین' شہروں' قصبوں' دیہات' جنگلوں' وادیوں گھاٹیوں اور دریاؤں پر سے گزرتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر مجھے نیند آ گئی اور میں کھڑکی کے شیشے سے سر لگا کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو ابر آلود فضاؤں میں دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ بارش رک گئی۔ سبزہ دھل کر ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی تو میں نیچے گیلے پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ فضا میں سگار' چائے اور گل مہر کے استوائی پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ سٹال پر کھڑے ہو کر چائے پی۔

انجن نے سیٹی دی تو میں ڈبے میں آ گیا۔

دن کے نو بجے کے قریب سری لنکا کی شمال مغربی بندرگاہ ٹالی مینار کے مضافات شروع ہو گئے۔ پھر ٹرین اونچے اونچے ناریل کے درختوں اور ریلوے یارڈ میں سے گزرتی ہوئی ٹالی مینار بندرگاہ میں بنے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر جا کھڑی ہوگئی۔ ہندوستان کی

جنوبی بندرگاہ دھنش کوڈی جانے والا بحری جہاز گودی کے ساتھ لگا تھا۔ ہندوستان جانے والے مسافر اتر کر بحری جہاز کی طرف بڑھے یہاں معمولی سی چیکنگ ہوئی۔ میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز پر سوار ہو گیا۔ جہاز کے ڈیک پر مدراسی بنگالی اور دوسرے صوبوں کے لوگ اپنے اپنے سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ جہاز نے وسل دیا اور سمندر میں روانہ ہو گیا۔



سرزمین ہندوستان پر واپسی

بادلوں بھرے آسمان کے نیچے بحری جہاز گہرے نیلے سمندر میں سفر کر رہا تھا۔ جونہی سری لنکا کے جزیرے کا ساحل آنکھوں سے اوجھل ہوا دوسری طرف ہندوستان کی جنوبی تکون کے ساحل کی لکیر نظر آنے لگی۔ تیز مرطوب سمندری ہوا چل رہی تھی۔ میں ڈیک کے جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہندوستان کے ساحل کو قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ جہاز دھنش کوڈی کی گودی کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ یہاں بھی گودی کے سامنے والے پلیٹ فارم پر مدراس جانے والی گاڑی مسافروں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ یہ براڈ گیج ٹرین تھی۔ پاسپورٹ وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں ہمیں ٹیکے ضرور لگائے گئے تھے۔ جب سارے مسافر ٹرین میں سوار ہو چکے تو ٹرین چل پڑی۔

رامیشورم تک سمندر ٹرین کی بائیں جانب ساتھ ساتھ رہا۔ پھر سمندر ہم سے دور ہوتا گیا۔ راکا ناتھم پہنچ کر سمندر غائب ہو چکا تھا۔ یہاں کا علاقہ زیادہ تر ریتلا تھا۔ ناریل کے درخت ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ مدراس تک بڑا لمبا سفر تھا۔ شام کے وقت مدورا کا شہر آیا۔ آدھی رات کو ٹرین ترچنا پلی پہنچی۔ دوسرے دن دس بجے آراوٹ کا شہر آیا۔ اور پورے بارہ بجے دن ٹرین مدراس کے بہت بڑے سنٹرل اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ یہاں گاڑی بدلنی تھی۔ ایک پلیٹ فارم پر دلی جانے والی گاڑی موجود تھی۔ دو بجے یہ گاڑی دلی کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ دو دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ مدراس سے کرنول' کرنول سے حیدر آباد' نظام آباد' عادل آباد اور پھر ناگ پور آ گیا۔ ناگ پور پہنچتے پہنچتے ایک دن اور ایک رات گزر چکی تھی۔ یہاں سے آگے نرسیا پور' ساگر' جھانسی' گوالیار' آگرہ' متھرا اور گوڑ گاؤں سے ہوتی ہوئی آخر ہماری ٹرین دلی پہنچ گئی۔

جھانسی تک تو حالات معمول کے مطابق تھے۔ لوگ انڈیا پاکستان کی باتیں ضرور کرتے تھے۔ انڈیا آزاد ہو گیا۔ ہر کسی کی زبان پر تھا۔ جھانسی سے آگے دلی تک انڈیا پاکستان کے تذکرے زیادہ شدت اختیار کر گئے تھے۔ دلی میں مجھے حالات میں کچھ تناؤ سا محسوس ہوا۔ لیکن اسٹیشن پر ابھی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔ میرا ٹکٹ امرتسر تک کا تھا۔ دلی سے مجھے امرتسر کے لیے پنجاب میل پکڑنی تھی۔ یہ ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ ان مسافروں میں سکھ بھی کافی تعداد میں تھے۔ ان میں کلاہ پوش مسلمان بھی تھے۔ دلی سے پنجاب میل چلی تو غازی آباد جا کر رکی۔ حالات یہاں بھی نارمل تھے۔ میرٹھ آ گیا۔ یہاں میں نے کچھ برقعہ پوش مسلم خواتین کو

پلیٹ فارم پر اپنے سامان کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ ٹرین میں فسادات کی باتیں شروع ہوگئی تھیں۔ سہارنپور تک خیریت رہی۔ انبالہ آیا تو میں نے ساٹھ ستر کے قریب مسلمان برقعہ پوش خواتین کو مہاجرین کی طرح پلیٹ فارم پر پڑے دیکھا۔ ایک مسافر نے دوسرے سے کہا۔

''یہ لوگ پاکستان جارہے ہیں۔''

آگ اور خون کا سفر

لدھیانہ اسٹیشن پر بھی مسلمانوں کو اپنے پلیٹ فارم پر اپنے سامان اور بال بچوں کے ساتھ پڑے دیکھا تو مجھے حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔ یہاں سکھ کرپانیں لگائے پھر رہے تھے۔ پولیس بھی موجود تھی۔ لدھیانہ سے ٹرین چلی تو مجھے کھیتوں میں دور مکانوں میں آگ لگی نظر آنے لگی۔ کہیں کسی گاؤں سے دھواں اٹھ رہا تھا تو کسی گاؤں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ کھیت ویران پڑے تھے۔ کہیں کوئی ہل نہیں چل رہا تھا۔ جالندھر کے قریب سکھ ہندوؤں کا ایک جلوس دیکھا جو تلواریں اور بندوقیں اٹھائے کھیتوں میں سے نعرے لگاتے گزر رہے تھے۔ ٹرین کو دیکھ کر وہ زیادہ زور شور سے نعرے لگانے لگے۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ٹرین کے ذریعے سفر کر کے غلطی کی ہے۔ مجھے ملک صاحب کے ساتھ بذریعہ بحری جہاز کراچی جانا چاہیے تھا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جالندھر آ رہا تھا۔ یہاں شاید کرفیو لگا تھا۔ کیونکہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جو آبادیاں تھیں ان کی سڑکیں اور گلی کوچے سنسان پڑے تھے۔ سوائے پولیس کے سکھ ڈوگرہ فوجیوں کے کوئی شہری نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے ڈبے میں ہندو سکھ بھی سوار تھے۔ دو مسلمان بھی تھے جو امرتسر جا رہے تھے۔ راستے میں ان سے دعا سلام ہو چکی تھی۔ ان میں سے ایک بزرگ صورت تھے۔ انہوں نے دبی زبان میں کہا۔

''آگے معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔''

جالندھر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سکھ ننگی تلواریں اٹھائے پھر رہے تھے۔ ہندو بندے ماترم کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ لوگ پلیٹ فارم کے جنگلے کے پیچھے تھے۔ وہ ۱۳ اگست کا دن تھا۔ ٹرین وہاں دیر تک رکی رہی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ فضا حبس آلود تھی۔ ہوا میں جلے ہوئے مکانوں اور انسانی لاشوں کی بو تھی۔ جالندھر سے ٹرین چلی تو کچھ دور آگے جا کر ہمیں ریلوے لائنوں کی دونوں جانب کٹی ہوئی انسانی لاشیں نظر آئیں۔ ٹرین سست رفتار کے ساتھ چل رہی تھی۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ اب میں واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک ٹرین امرتسر کی طرف سے آئی۔ وہ ہندو سکھ شرنارتھیوں سے بھری ہوئی تھی۔ سکھ ہندو شرنارتھی ٹرین کی چھت پر بھی بیٹھے

ہوئے تھے اور ست سری اکال اور جے ہند کے نعرے لگا رہے تھے۔

ابھی کرتار پورہ نہیں آیا تھا کہ رات کا اندھیرا چھانے لگا۔ کھیتوں میں دور آگ کے شعلے اٹھتے نظر آئے۔ ظاہر ہے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ ہمارے ڈبے میں جو سکھ بیٹھے تھے وہ بھی کھڑکی سے منہ باہر نکال کر نعرے لگا رہے تھے۔ شاید وہ ہمیں ہمیں ہندو سکھ سمجھ رہے تھے۔ کرتار پورے کا اسٹیشن ابھی ایک فرلانگ دور ہوگا کہ ٹرین رک گئی۔ پھر کھیتوں کی طرف سے ست سری اکال اور جے ہند اور ہر ہر مہادیو کے نعروں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ پھر ٹرین پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرے ساتھی مسلمان بھی گھبرا گئے۔ ہم نے ڈبے کے سکھ مسافروں پر یہی ظاہر کیا تھا کہ ہم ہندو ہی۔ میرے پاس ہی جو مسلمان بیٹھا تھا اس نے میرے کان میں کہا۔

''جان بچا کر جدھر منہ اٹھتا ہے بھاگ جاؤ' حملہ ہو گیا ہے۔''

میں نے ڈبے کے سکھ مسافروں کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرف کھڑکی میں سے سر باہر نکالے نعرے لگا رہے تھے جس طرف سے ہندو سکھوں کا جتھہ ٹرین پر گولیاں برساتے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے دوسری طرف سے ڈبے کا دروازہ کھولا اور اندھیرے میں نیچے ریلوے لائن کے پاس اتر کر سامنے والے کھیتوں کی طرف بھاگا۔ یہ مکئی کا اونچا کھیت تھا۔ میں اس میں گھس گیا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ جو دو مسلمان میرے ساتھ ڈبے میں سوار تھے' وہ کدھر چلے گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے ٹرین سے عورتوں اور مردوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ ہندو سکھ ٹرین میں سوار مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے۔

میں نے کھیت کے اندر تیز تیز بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک کھیت ختم ہوا تو دوسرے کھیت میں گھس گیا۔ چیخ و پکار کی آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ مجھے اپنی جان کی فکر تھی۔ میں اپنی جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔ فصل سے نکلا تو سامنے ایک اور کھیت آ گیا جو کٹا ہوا تھا۔ میں دوڑتا چلا گیا۔ آگے ایک چھوٹی سی نہر دکھائی دی۔ میں اس کے کنارے جھاڑیوں میں ذرا دم لینے کو بیٹھ گیا۔ میں تھک گیا تھا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ پیچھے نظر ڈالی' کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹرین کو اونچی فصل نے چھپا دیا تھا۔ انسانوں کی چیخوں کی آوازیں اب مدھم پڑ گئی تھیں۔ ست سری اکال اور جے ہند کے نعرے کبھی کبھی سنائی دے جاتے تھے۔ میں پاکستان سے کافی دور تھا۔ امرتسر سے بھی دور تھا۔ اس سارے علاقے پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ مسلمانوں کو جگہ جگہ قتل کیا جا رہا تھا۔ ان کے گھروں کو لوٹ کر آگ لگائی جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں امرتسر کا رخ کروں یا واپس دلی کی طرف چل دوں۔ دونوں طرف شدید خطرہ تھا۔

میں نہر کی چھوٹی سی پلیا کو عبور کر کے سامنے والے اندھیرے کھیتوں میں آ گیا اور جدھر میرا منہ تھا اسی طرف چلنے لگا۔ چلتے چلتے رات گہری ہوگئی۔ کھیت ختم ہوئے تو ایک کچا راستہ نظر آیا۔ اس کی دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت تھے۔ یہاں مجھے ایک بیل گاڑی الٹی ہوئی دکھائی دی۔ قریب پہنچا تو ایک گاڑی بان کی لاش کٹی پڑی تھی۔ میں گھبرا کر جلدی سے ٹاہلیوں کے نیچے سے ہو کر دوسری طرف چلنے لگا۔ یہ خالی میدان تھا۔ کہیں گھاس اگی ہوئی تھی اور کہیں مٹی ہی مٹی تھی۔ مجھ پر ایک خوف سا طاری تھا۔ یہ خوف میں نے درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں مسلمان تھا اور ہندو سکھوں کے علاقے میں گھر گیا تھا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اگلا جو گاؤں آئے گا وہاں میں زندہ بھی بچ سکوں گا یا نہیں۔ چلتے چلتے تھک جاتا تو وہیں کسی جگہ تھوڑی دیر بیٹھ جاتا اور پھر چلنا شروع کر دیتا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا گاؤں آیا۔ وہاں اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو مجھے اندھیرے میں جگہ جگہ عورتوں اور بچوں کی کٹی ہوئی لاشیں دکھائی دیں۔ ایک کتا مجھے دیکھ کر غرایا۔ میں جلدی سے دوسری طرف ایک کھال میں اتر گیا۔ کھال کو پار کر کے دوسرے کنارے پر آیا تو سامنے حد نگاہ تک فصلیں پھیلی تھیں۔

میرے پاؤں درد کرنے لگے تھے۔ مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ انسان کس کس طرح سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ میں بھی ان فصلوں میں گھس گیا۔ خدا جانے رات کتنی گزر گئی تھی کہ میں فصلوں سے باہر نکلا۔ سامنے ایک بڑی نہر بہہ رہی تھی۔ اچانک مجھے دور سے ست سری اکال کا نعرہ سنائی دیا۔ میں جلدی سے کھیت میں گھس کر چھپ گیا۔ تھوڑی دیر میں نہر کی پٹڑی پر سے ہندوؤں اور سکھوں کا ایک جتھہ نعرے لگاتا گزر گیا۔ اندھیرے میں مجھے ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں دکھائی دیں۔ میں اپنی جگہ پر سٹ گیا۔ جب یہ جتھہ نہر کنارے چلتا ہوا کافی دور نکل گیا تو میں کھیت میں سے نکل آیا۔

کھیتوں میں ایک جگہ مجھے کچی کوٹھڑی نظر آئی۔ اس کا دروازہ نہیں تھا۔ اندر ہرا چارہ بھرا ہوا تھا۔ یہاں میں کچھ دیر آرام کر سکتا تھا۔ میں کوٹھڑی میں آ کر چارے کے ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ مگر پانی وہاں نہیں تھا۔ میں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتا تھا مگر میں اس قدر تھک گیا تھا کہ مجھ پر نیند نے حملہ کر دیا۔ میں اونگھنے لگا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو کوٹھڑی کے باہر دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کھیت میں کوئی آدمی نظر نہ آیا۔

میں کوٹھڑی سے نکلا اور کھیتوں کے درمیانی مینڈھ پر چلنے لگا۔ آگے ایک چھوٹا سا نالہ آ گیا' وہاں میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پی کر پیاس بجھائی اور کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک کھیت ویران پڑے تھے۔ ایک جگہ کھیتوں میں مسجد کے سفید مینار دیکھے تو میرے اندر جیسے ایک نئی طاقت پیدا ہو گئی۔ میں مسجد کی طرف چلنے لگا۔ راستے میں مجھے کوئی سکھ کسان نہ ملا۔ مسجد کے قریب

پہنچا تو اس کی داہنی جانب چند کچے مکان نظر پڑے جن کے دروازے جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ ان مکانوں کی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مسجد کا دروازہ کھلا تھا۔ میں مسجد کے کچے صحن میں آ گیا۔ صحن میں ایک جانب دھریک کا پیڑ تھا۔ مسجد کے محراب کے پاس گیا تو میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

موت کو قریب سے دیکھا

محراب کے نیچے ایک مولوی صاحب کی لاش پڑی تھی۔ ان کی گردن آدھی کٹی ہوئی تھی اور لباس خون میں لت پت تھا۔ خون جم کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ میرے جسم میں دہشت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور میں مسجد کی دیوار پھاند کر دوسری طرف بھاگا۔ یہاں بیریوں کے درخت تھے۔ ان کے درمیان سیاہ رنگ کے سرکنڈوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ میں بھاگنے کی بجائے اب اس طرح چل رہا تھا جیسے مجھے کوئی ڈر یا خوف نہیں ہے۔ آگے ایک اونچا ٹبہ تھا۔ ٹبہ پار کیا تو سامنے ایک چھوٹی برانچ نہر تھی۔ اس نہر کے کناروں پر بھی دونوں جانب اونچے اور گھنے درخت تھے۔ میں نہر کے کنارے کنارے اوپر کی طرف چل پڑا۔ مشکل ایک فرلانگ چلا ہوں گا کہ نہر کے کنارے جو ڈھلان پر کھیت تھے اس میں سے دس بارہ سکھ باہر نکل کر نہر کی پٹڑی پر آ گئے۔ وہ مجھ سے بمشکل پچاس قدم دور ہوں گے۔ پہلے خیال آیا کہ نہر میں چھلانگ لگا دوں یا پیچھے کو بھاگ جاؤں۔ لیکن ایک سیکنڈ میں نے محسوس کر لیا کہ یہ لوگ بڑی آسانی سے مجھے پکڑ سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ان کے قریب سے ایسے گزر جاؤ جیسے تم ہندو ہو۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک ہندو نام بھی سوچ لیا۔ اندر سے میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ لیکن بڑی ہمت کر کے یوں ان کی طرف چلنے لگا جیسے واقعی میں مسلمان نہیں بلکہ کوئی ہندو ہوں۔

ان سکھوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ انہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کا قتل عام کرتے آ رہے ہیں اور قتل کرنے جا رہے ہیں۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو وہ مجھے گھورنے لگے۔ میرے قدم ذرا سے لڑکھڑائے۔ مگر میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور انہیں ست سری اکال کہا۔ ایک سکھ نے مجھے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا۔

اس نے پوچھا۔ ''کون ہو بھئی؟''

میں نے کہا۔ ''میرا نام موہن لال ہے۔ ساتھ والے گاؤں کا پٹواری میرا ماموں ہے' اس کے گھر جا رہا ہوں۔''

دوسرے سکھ نے کہا۔ ''اوئے' یہ جھوٹ بول رہا ہے' اس کی پتلون اتار کر دیکھو۔''

میرا خون جم گیا۔ آنکھوں میں موت پھرنے لگی۔ دوسرے لمحے انہیں معلوم ہو گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ ایک سکھ نے مجھے گردن سے پکڑ کر گرا دیا۔ دوسرا بولا۔ ''اوئے اسے اسی جگہ کاٹ کر نہر میں پھینک دو۔''

میری زندگی ابھی باقی تھی' اسی لمحے پیچھے سے کوئی گھوڑ سوار کھیتوں میں سے نکل کر نہر کی پٹری پر آ گیا۔ اس نے وہیں سے چلا کر کہا۔

''اوئے کون ہے یہ؟''

سکھ کی میرے اوپر اٹھی ہوئی تلوار وہیں رک گئی۔

''مسلا ہے' اس کا جھٹکا کرنے لگا ہوں۔''

اتنی دیر میں گھڑ سوار جو خود ایک سکھ تھا اور جس نے منہ پر ڈاٹھا باندھ رکھا تھا اور کندھوں پر بندوق لٹک رہی تھی' میرے قریب آ چکا تھا' بولا۔

''ٹھہر واوئے' اسے میں گولی ماروں گا۔''

پھر اس نے کاندھے سے بندوق اتار کر اپنے ہاتھوں میں تھامی اور میری طرف دیکھا۔ اچانک اس کے ہاتھ وہیں ساکت ہو گئے۔ موت کے خوف سے میں نیم جاں ہو چکا تھا۔ وہ سکھ گھوڑے پر سے اتر کر میرے پاس آ گیا۔ پھر اس نے منہ پر سے ڈاٹھا اتار دیا۔

وہ صوبیدار پیارا سنگھ تھا۔

صوبیدار پیارا سنگھ نے ان سب کو پرے ہٹا دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

''تم یہاں کہاں سے آ گئے؟''

اس نے اپنے سکھ ساتھیوں سے کہا۔ ''یہ اپنا دوست ہے' تم آگے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ میں اسے گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔''

سارے سکھ حیرانی سے کبھی مجھے اور کبھی پیارا سنگھ کو دیکھ رہے تھے۔ پیارا سنگھ نے غصے سے کہا۔ ''اوئے جاتے کیوں نہیں ہو؟''

سکھ جتھے کی شکل میں وہاں سے آگے چل دیئے۔ صوبیدار پیارا سنگھ نے مجھے ایک بار پھر حیرت سے دیکھا اور کہا۔

''تم کولمبو سے یہاں کس طرح آ گئے؟ کیپٹن ملک صاحب کہاں ہیں؟۔۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔''

صوبیدار پیارا سنگھ نے مجھے موت کے منہ سے باہر نکال لیا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ اگر وہ ایک سیکنڈ کی دیر کر دیتا تو میری کٹی ہوئی لاش نہر کے پانی میں تیر رہی ہوتی۔

پیارا سنگھ میرے ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ گھوڑا اس کے ساتھ تھا۔ نہر کی ڈھلان سے نیچے کھیت کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے میں

نے اسے اپنی ساری کہانی سنا ڈالی کہ کس طرح پاکستان کے اعلان کے بعد کیپٹن ملک نے مجھے اپنے ساتھ بذریعہ بحری جہاز پاکستان لے جانا چاہا مگر میں ضد کر کے ٹرین کے سفر پر روانہ ہو گیا اور پھر کیسے کرتار پورہ کے قریب ٹرین پر حملہ ہو گیا اور میں ساری رات کھیتوں میں بھاگتا رہا۔ پیارا سنگھ خاموشی سے میری کہانی سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"اس گاڑی کے سارے مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا' تم خوش قسمت ہو کہ بھاگ کر یہاں آ گئے۔ یہاں بھی اگر میں وقت پر نہ پہنچ جاتا تو ان لوگوں نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔"

میں چپ ہو گیا۔

دور ایک گاؤں کے کچے مکان ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس گاؤں میں پیارا سنگھ کا ایک کشادہ مکان تھا۔ صحن میں گائے بندھی تھی۔ ایک طرف کھرلی اور ٹوکا پڑا تھا۔ برآمدے کے صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ مٹی کے چولہے چوکے پر ایک خوبصورت سکھ عورت بیٹھی کڑاہی میں کچھ تل رہی تھی۔ پیارا سنگھ نے جاتے ہی پوچھا۔

"گوبندا ابھی تک سو رہا ہے؟"

عورت نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولی۔ "ساری رات تو پیتا رہا ہے۔"

پیارا سنگھ نے گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اوئے شراب تو ہم بھی ساری رات پیتے ہیں' پر اس طرح تو نہیں سوتے۔ اچھا ایسا کرو چائے بنا دو ہمیں۔"

عورت نے کہا۔ "یہ کس کو اپنے ساتھ لائے ہو؟"

"صوبیدار پیارا سنگھ میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "یہ اپنا پرانا یار ہے' مسلمان لڑکا ہے۔"

اس پر خوبصورت سکھ عورت نے چونک کر مجھے دوبارہ غور سے دیکھا۔ پیارا سنگھ نے بندوق چارپائی پر رکھی اور بولا۔

"اسے کسی طرح پاکستان پہنچانا ہے۔ آج ۱۴ اگست ہے۔ پاکستان بن گیا ہے۔ انڈیا بھی آزاد ہو گیا ہے۔"

پھر میری طرف دیکھ کر پیارا سنگھ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیوں یار تو پاکستان جائے گا کہ ہندوستان میں رہے گا؟"

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"میں تو امرتسر جانا چاہتا ہوں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے پاس۔"

پیارا سنگھ نے اپنی پگڑی کھول کر دوبارہ باندھتے ہوئے کہا۔"امرتسر میں تو ایک بھی مسلمان نہیں رہا۔ یا قتل ہو گئے یا رفیوجی کیمپ میں چلے گئے اور جو خوش قسمت تھے پاکستان پہنچ گئے۔۔۔۔۔۔۔تو کہاں جانا چاہتا ہے؟"

میں نے کہا۔"تو پھر مجھے پاکستان پہنچا دو کسی طرح سے۔"

امرتسر کی تباہی کا حال سن کر میں دل میں سخت پریشان ہو گیا۔خدا جانے میرے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر کیا گزری ہوگی۔وہ زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔میں نے پیارا سنگھ سے پوچھا کہ رفیوجی کیمپ امرتسر میں کہاں ہے۔اس نے بتایا کہ شریف پورے کی آبادی کو کیمپ بنا دیا گیا ہے اور وہاں بلوچ رجمنٹ کی ایک کمپنی مورچہ سنبھالے ہوئے ہے۔میں نے امرتسر رفیوجی کیمپ میں جانے کی خواہش ظاہر کی تو وہ بولا۔

"کوشش کروں گا'تم چائے تو پیو۔"

پھر سکھ عورت کو کہنے لگا۔"گورمیت!اس کو دو پراٹھے بنا دو'یہ کل سے بھوکا ہے بے چارا۔"

گورمیت نے کوئی جواب نہ دیا'آٹے کی پرات آگے کر کے چولہے کے پاس بیٹھ گئی اور پراٹھے بنانے لگی۔معلوم ہوا کہ یہ عورت پیارا سنگھ کے چھوٹے بھائی گوبند سنگھ کی بیوی تھی۔پیارا سنگھ کے اپنے بیوی بچے پٹیالہ میں تھے اور وہ چھوٹے بھائی کے گھر میں آیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں ایک کوٹھڑی میں سے ایک نوجوان سکھ باہر نکلا۔اس کے ڈاڑھی اور سر کے بال کھلے تھے۔وہ پورا کھلا ہوا سکھ تھا۔اس نے صرف دھوتی باندھ رکھی تھی۔وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا اور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔"یہ کون ہے بھرا جی؟"اس نے پیارا سنگھ سے پوچھا۔

پیارا سنگھ نے بندوق پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔"یہ مسلمان ہے۔"

گوبند سنگھ کرخت لہجے میں بولا۔"تو پھر اسے ختم کیوں نہیں کرتے'اسے یہاں کیوں لے آئے ہو؟"

پیارا سنگھ نے اسے غصے میں گالی دی اور کہا۔"یہ میرا دوست ہے'سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ایک بار اس نے کولمبو کے جنگلوں میں میری جان بچائی تھی'اب اس کی جان بچانا میرا فرض بن گیا ہے۔"

پیارا سنگھ نے مجھے ناشتہ کروایا اور بولا۔

"تم اندر میری کوٹھڑی میں جا کر سو جاؤ۔"

میں ہچکچایا تو وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

”اوئے ڈرتے کیوں ہو۔۔۔۔۔۔۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جاؤ' وہ سامنے اولی کوٹھڑی میں جا کر سو جاؤ۔ میں دوپہر کے بعد آؤں گا۔ پھر تمہیں امرتسر کیمپ پہنچانے کی کوشش کروں گا۔“

میں ڈرتے ڈرتے اٹھا اور سامنے والی کوٹھڑی میں چلا گیا' جہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ بستر تہہ کر کے سرہانے کی طرف لگا دیا گیا تھا۔ اس کوٹھڑی میں بڑا قیمتی سامان کونے میں ڈھیری کی طرح لگا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مسلمانوں کے گھر سے لوٹ کر لایا ہوا سامان ہے۔ میں چپکے سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مجھے باہر پیارا سنگھ اور گوبند سنگھ کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گوبند سنگھ کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں نے پاکستان میں ہمارے لوگوں کو مارا ہے' ہم یہاں کے مسلمانوں کو کیوں زندہ چھوڑیں۔ پیارا سنگھ اسے ڈانٹتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ لڑکا میرا دوست ہے۔ اس نے میری خاطر انگریز کا تشدد برداشت کیا اور میرے ٹھکانے کا پتہ نہیں بتایا' میں اس کی حفاظت کروں گا۔ خبردار، یہاں کسی کو خبر نہ ہو کہ ایک مسلمان میری کوٹھڑی میں ہے' نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ مجھے پیارا سنگھ کے باہر جانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے جانے کے بعد مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ کیا خبر یہ گوبند سنگھ دوسرے سکھوں کو میری خبر کر دے اور وہ لوگ یہاں آ کر مجھے قتل کر ڈالیں۔ گوبند سنگھ بعد میں پیارا سنگھ کو کہہ سکتا ہے کہ بھرا جی میں کیا کرتا' پورا جتھہ آ گیا تھا نہنگوں کا۔

مسلمان لڑکی

طرح طرح کے وسوسے میرے دل میں اٹھ رہے تھے۔ کبھی سوچتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ امرتسر شریف پورے کی آبادی میں تو کیمپ بن ہی گیا ہے۔ اور وہاں اپنی بلوچ رجمنٹ کے سپاہی بھی ہیں' کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاؤں گا۔ پھر خیال آتا کہ کہیں یہ گوبند سنگھ ہی میرے پیچھے نہ لگ جائے اور آگے کھیتوں میں جا کر مجھے قتل کر ڈالے اور پیارا سنگھ کو یہ کہہ دے کہ لڑکا بھاگ گیا تھا' راستے میں اکالیوں نے اسے مار ڈالا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ساری رات کا جاگا ہوا تھا مگر اس خوف اور دہشت کی وجہ سے نیند پھر بھی نہیں آ رہی تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ میں نے بند کر لیا تھا۔ میں نے دروازے کی درز میں سے باہر صحن میں دیکھا' گوبند سنگھ پمپ میں سے پانی نکال کر منہ دھو رہا تھا۔ پھر قمیض الگنی پر سے اتار کر پہنی اور کرپان کمر میں ڈال کر بولا۔

”چلتا ہوں' آج نہر پار والے گاؤں کے مسلمانوں کی باری ہے۔ کل سے انہوں نے مورچہ بنایا ہوا ہے۔ ان میں ایک ریٹائر فوجی ہے۔ اس کے پاس اسلحہ ہے۔ آج ختم ہو جائے گا اس کا اسلحہ' کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔“

دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ اپنی بیوی گورمیت کور کی طرف مڑ کر کہنے لگا۔ "اس مسئلے کے بارے میں کوئی آئے تو مت بتانا۔ بھراجی کا خیال ہے' کیا کروں۔"

وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ خوبصورت سکھ عورت گورمیت کور بالٹی کے پاس بیٹھ کر ہاتھ دھونے لگی۔ اس کی بانہوں کا سونے کا چوڑا چھنک رہا تھا۔ مجھے یونہی خیال آیا کہ خدا جانے یہ کس بدنصیب مسلمان عورت کا چوڑا ہوگا۔ سکھ عورت منہ دھو کر پر دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھتی میری کوٹھری کی طرف آئی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سکھ عورت نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کوٹھری میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔ اب میں باہر نہیں نکل سکتا۔ بار بار خیال آتا کہ پیارا سنگھ بڑا کچا کام کر کے گیا ہے۔ اگر اس وقت سکھوں کا کوئی جتھہ ادھر آ جائے' فرض کر لیا گوبند سنگھ ہی کسی جتھے کو ادھر بھیج دے تو اکیلی سکھ عورت ان کا مقابلہ کہاں تک کر سکے گی۔ وہ تو کوٹھری میں سے مجھے نکال کر کرپان مار کر ہلاک کر دیں گے۔

سخت بے چینی کی حالت میں چارپائی پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ کان باہر کی آواز پر لگے تھے۔ کسی درخت پر کوئی کوا بھی زور سے بولتا تو یہی لگتا کہ سکھوں کا جتھہ آ گیا ہے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مجھے دور سے "جو بولے سو نہال' ست سری اکال" کا جیکارا سنائی دیا۔ میں سہم گیا۔ نعروں کی آوازیں قریب آ گئی تھیں۔ پھر کسی سکھ نے باہر سے پیارا سنگھ کو آواز دے کر بلایا۔

"پیارا۔۔۔۔۔۔۔"

گورمیت نے جواب دیا۔ "وہ باہر گیا ہے۔"

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسی سکھ کی آواز آئی۔ "بھابو! دروازہ کھولنا ذرا"

صحن کا دروازہ کھولنے کی آواز سنائی دی۔ اسی سکھ نے کہا۔

"بھابھو! یہ مسلمان لڑکی ہے' اسے کوٹھری میں بند کر کے تالا لگا دو۔ قافلے سے اٹھائی ہے۔ اگلے جا رہے ہیں واپسی پر لیتے جائیں گے۔"

میں نے جلدی سے بند دروازے کی درز میں سے باہر دیکھا۔ دو سکھ ہاتھوں میں برچھے لیے کھڑے تھے۔ یہ زرد کپڑوں زرد پگڑیوں والے نہنگ تھے۔ انہوں نے ایک لڑکی کو پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی بالکل مردہ ہو رہی تھی۔ اس میں جان نہیں تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ سکھ نہنگ نے اسے اندر صحن میں دھکیل کر گالی دی اور گورمیت کور سے کہا۔

"بھابھو! ابھی تھوڑی دیر میں آ کر لے جائیں گے۔ اسے کوٹھری میں تالا لگا کر رکھنا۔"

اور وہ "جو بولے سو نہال۔۔۔۔۔۔" کا نعرہ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ گورمیت کور نے مسلمان لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اسے ڈانتی' برا بھلا کہتی' کھینچتی ہوئی دوسری کوٹھڑی کی طرف لے گئی۔ لڑکی منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ مزاحمت بھی برائے نام کر رہی تھی۔ اس مسلمان لڑکی کو کوٹھڑی میں بند کر کے گورمیت نے باہر تالا لگا دیا۔ میں سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

مسلمان لڑکی ساتھ والی کوٹھری میں بند تھی۔

میں اسے ہندو سکھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔ لیکن صورت حال ایسی تھی کہ خود میری جان محفوظ نہیں تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب قتل ہو جاؤں۔ چاروں طرف مسلمانوں کی جان و مال کے دشمن بلمیں' تلواریں' بندوقیں اور کرپانیں لیے درندوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور کبھی بے چینی کے عالم میں بند کوٹھڑی میں ٹہلنے لگتا۔ کبھی بند دروازے کی درز میں سے باہر دیکھتا۔ صحن میں صوبیدار پیارا سنگھ کی چھوٹی بھابی گورمیت کور روٹیاں پکا رہی تھی۔ اسی الجھن اور ذہنی کشمکش میں دوپہر ہو گئی۔ کسی کسی وقت دور سے سکھوں' ہندوؤں کے نعروں کی آواز آ جاتی تھی۔ باہر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازے میں سے باہر دیکھا۔ صحن کی کچی دیوار کے اوپر سے مجھے صوبیدار پیارا سنگھ دکھائی۔ اس نے گھوڑے کو باہر باندھا اور دروازہ کھول کر مکان کے صحن میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی۔ گٹھڑی چارپائی پر رکھتے ہوئے گورمیت سے کہا۔

"یہ میرے دوسرے سامان میں رکھ دو۔"

اور خود پمپ چلا کر ہاتھ دھونے لگا۔ وہ یوں رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھو رہا تھا جیسے خون کے دھبے دھو رہا ہو۔ ظاہر ہے وہ کسی مسلمان کا خون کر کے کسی مسلمان کے گھر کے زیور وغیرہ لوٹ کر آیا تھا۔ میرا دل خوف سے بیٹھنے لگا۔ کسی وقت پیارا سنگھ مجھے نجات دہندہ معلوم ہوتا اور کسی وقت لگتا کہ یہ مجھے اپنی کرپان سے ذبح کر دے گا۔ جیب سے میلا کچیلا رومال نکال کر اس سے اپنے ہاتھ پونچھتا ہوا وہ گورمیت کے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اور اس سے میرے بارے میں پوچھا۔

گورمیت کور نے بیزاری سے کہا۔

"تمہارا مسلا ٹھیک ٹھاک ہے۔"

پھر اس نے پیارا سنگھ کو بتایا کہ نہنگ کرپالا ایک مسلمان عورت کو اندر رکھوا گیا ہے۔ پیارا سنگھ نے رومال سے اپنی ڈاڑھی صاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ باز نہیں آئیں گے' عورتیں تو گائیں ہوتی ہیں۔ لاؤ روٹی ڈال دو۔ میرے یار کو روٹی کھلائی کہ نہیں؟''

گورمیت کور نے نفرت سے سر کو ہلکا سا جھٹک کر کہا۔

''تم ہی جا کر کھلا دو اسے روٹی۔''

پیارا سنگھ بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے' لاؤ مجھے دے دو۔ اس کی روٹی بھی چنگیر میں ڈال دو۔''

چنگیر میں دو چار پراٹھے ڈلوا کر پیارا سنگھ میری کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس نے آدھا دروازہ کھلا ہی رکھا۔ باہر سے تازہ ہوا کوٹھڑی میں آنے لگی۔ پیارا سنگھ میرے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چنگیر درمیان میں رکھ لی اور بولا۔

''لو یار روٹی کھا لو گھر کے گھی کے پراٹھے ہیں' میٹھے پراٹھے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے پیارا سنگھ جی۔''

اس نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ مار کر کہا۔ ''ارے تو فکر کس لیے کرتا ہے' سوں گورو کی تیری ہوا کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔''

میں نے نوالہ توڑتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ''مجھے امرتسر کے رفیوجی کیمپ میں کب لے جاؤ گے؟''

پیارا سنگھ بولا۔ ''نہنگ چاروں طرف جتھے لیے پھر رہے ہیں' ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن میں ان کی پروا بھی نہیں کرتا۔ آج آدھی رات کو تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔''

تب میں نے پیارا سنگھ کو بتایا کہ ساتھ والی کوٹھڑی میں ایک مسلمان لڑکی بند ہے اور میں اسے بھی اپنے ساتھ کیمپ میں لے جانا چاہتا ہوں۔ پیارا سنگھ سر جھکائے روٹی کھا رہا تھا۔ کچھ دیر تک اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بھی سوال دہرانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے ڈر تھا کہ پیارا سنگھ انکار کر دے گا۔ پیارا سنگھ پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے بولا۔ ''کرپالا نہنگ اسے رکھوا گیا ہے وہ تو اسے لینے تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔''

میں مایوس ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ یہ بدنصیب لڑکی اب شاید ہی پاکستان میں واپس جائے۔ پیارا سنگھ یہاں مجبور لگتا تھا۔

میں نے بمشکل ایک پراٹھا کھایا' صوبیدار پیارا سنگھ باقی سارے پراٹھے ہڑپ کر گیا۔ پھر ہاتھوں کو داڑھی پر پھیرتے ہوئے اٹھا اور بولا۔

''جو ہوگا دیکھا جائے گا' تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ ایک منٹ ٹھہرو میں اس لڑکی کو باہر نکال لاؤں۔''

یہ کہہ کر وہ کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ اس طرح بند کیا کہ باہر جھانک سکوں۔ گورمیت کور روٹیاں پکا رہی تھی اور پمپ کے نیچے پلاسٹک کی بالٹی کے پاس بیٹھی ہاتھ دھو رہی تھی۔ پیارا سنگھ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ایک کوٹھڑی چھوڑ کر کونے والی کوٹھڑی کی کنڈی کھول کر اندر گھس گیا۔ اس کی بھابی گورمیت کور اسے اندر جاتے دیکھتی رہی ار کچھ نہ بولی۔ وہ خود سکھنی تھی اور سکھوں کے عام مزاج اور خصلت سے واقف تھی۔ لیکن پیارا سنگھ کو سمجھنے میں اس نے غلطی کی تھی۔ پیارا سنگھ دوسری قسم کا سکھ تھا۔ جب پیارا سنگھ سہمی ہوئی مسلمان لڑکی کو کوٹھڑی سے نکال کر باہر لایا تو گورمیت کور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اس کو باہر کیوں نکالا ہے؟''

پیارا سنگھ نے اسے کوئی جواب نہ دیا' سنی ان سنی کر دی اور مجھے آواز دی کہ باہر آ جاؤ۔ میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ جلدی سے باہر صحن میں آ گیا۔

''میرے ساتھ آ جاؤ۔''

اب گورمیت کور نے غصے سے کہا۔

''اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔ وہ کرپالا آئے گا تو میں کیا جواب دوں گی؟''

صوبیدار پیارا سنگھ نے لڑکی کی کلائی پکڑ رکھی تھی۔ لڑکی بدحواس تھی۔ پیارا سنگھ نے کہا۔ ''اس کو میں جواب دے دوں گا' تم بیچ میں ٹر ٹر مت کرو۔''

گورمیت کور چلائی۔ ''کرپالا میرے آدمی کا دشمن بن جائے گا۔''

پیارا سنگھ صحن کے دروازے میں رک گیا۔ گورمیت کور کی طرف دیکھ کر اس نے کرپالے تہنگ کو ایک گالی دی اور کہا۔ ''گوبند سنگھ کو کرپالا ہاتھ تو لگا کر دیکھے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے ملٹری کی ٹریننگ کس دن کے لیے لی تھی۔''

وہ مسلمان لڑکی کو قریباً کھینچتا ہوا مکان کے دروازے سے باہر لے آیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دوپہر کی فضا میں ایک خون آلود اداسی رچی ہوئی تھی۔ ہوا میں جلے ہوئے مکانوں اور جلی ہوئی لاشوں کی بو تھی۔ قریب ہی دھریک کے درخت تلے اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے مسلمان لڑکی کو گھوڑے پر بٹھایا۔ مجھے ساتھ لیا اور کھیتوں میں چل پڑا۔ ہم دونوں پیدل چل رہے تھے۔ پیارا سنگھ خاموش تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ ہمیں کہاں لیے جا رہا ہے۔ میں اس سے کچھ پوچھنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ ریڈیو سیلون کی باتیں کرنے لگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کا ذہن کچھ سوچ رہا ہے۔ اچانک

موضوع بدل کر بولا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے گھوڑے پر بیٹھی مسلمان لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''کڑیے! تم بھی نہ گھبراؤ' جب تک پیارا سنگھ زندہ ہے تمہیں کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ میں مر گیا تو پھر تم جان اور واہگورو جانے۔''

پیارا سنگھ کی رائفل گھوڑے کی کاٹھی کے ساتھ لگی تھی۔ اب میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ وہ بولا۔

''میرا ایک یار ہے اجاگر سنگھ ۔۔۔۔۔۔ بس اسے تم پیارا سنگھ ہی سمجھو' اس کے پاس جا رہے ہیں۔ یہ میری بھابو اور بھرا بڑے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔''

اس نے دونوں کو موٹی گالی دی۔ ہم چری کے کھیتوں میں جا رہے تھے۔ ہماری بائیں طرف ایک چھوٹا سا گاؤں آیا جو ویران پڑا تھا۔ ایک کتا پیپل کے چبوترے کے پاس کھڑا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔ گاؤں کی طرف سے عجیب سی بو آئی۔ پیارا سنگھ بولا۔

''اس گاؤں کے سارے مسلمان ختم کر دیے گئے ہیں۔''

گھوڑے پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو ایک گہری چپ لگی تھی۔ وہ ایک ایسے پتھر کی طرح لگ رہی تھی۔ جس کے اوپر سے خون کا سیلاب گزر گیا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز پیچھے رہ گئی۔ اب سامنے ایک اور گاؤں دکھائی دیا۔ اس گاؤں میں ایک گردوارے کے برج تیسرے پہر کی دھوپ میں دور سے نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں دھریک کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ پیارا سنگھ نے گھوڑے کو کھیت سے باہر کیکر کے درخت تلے کھڑا کیا۔ لڑکی کو سہارا دے کر نیچے اتارا اور کہنے لگا۔

''تم لوگ یہاں بیٹھ جاؤ' میں دو گھوڑیاں لے کر آتا ہوں۔''

وہ ہمیں چھوڑ کر گاؤں کی طرف چلا گیا۔ میں اور مسلمان لڑکی کیکر کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ اب میں نے لڑکی سے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کس گاؤں کی رہنے والی ہے اور نہنگ اسے کہاں سے پکڑ کر لائے تھے۔ مسلمان لڑکی کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں' آنکھیں دہشت کے مارے ابھی تک سفید ہو رہی تھیں۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے چادر سے اپنا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ میرے سوالوں کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ جب میں نے اصرار کر کے پوچھا کہ وہ کس گاؤں کی ہے اور اس کے ماں باپ کہاں ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس لڑکی کے بھیانک مصائب کی اندوہناک تفصیل بیان کرنے کی یہاں میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ سب جانتے ہیں کہ اس آگ اور خون کے طوفان میں کس

پر کیا بیتی۔

مختصراً یہ کہ اس لڑکی کا گاؤں وہاں سے چھ سات کوس دور تھا۔ جتھے نے حملہ کیا' سب آدمیوں کو شہید کیا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بھی شہید کر دیے گئے۔ اس لڑکی کو نہنگ کرپالا نے اغوا کر لیا۔لڑکی کا نام صاحباں تھا۔ میں اسے کیا حوصلہ دیتا۔۔۔۔۔۔ خاموش بیٹھا رہا۔

لڑکی کے آنسو خشک ہوئے تو ہاتھوں کو ملتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔۔۔۔۔ اللہ جی۔۔۔۔۔۔ اللہ جی۔۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ بار بار کہنے لگی۔ اس کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب میں نے اسے یہ کہہ کر تھوڑا سا حوصلہ دیا کہ ہر طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے' صبر کرو۔۔۔۔۔۔ ہم پاکستان پہنچ جائیں گے۔ لڑکی نے جیسے میری بات کو بالکل نہیں سنا تھا۔۔۔۔۔۔ اللہ میاں' یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ اللہ جی یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ کہتی رہی اور روتی رہی۔

اجا گر سنگھ

دور سے پیارا سنگھ آتا دکھائی دیا۔ ایک گھوڑی پر وہ خود بیٹھا تھا دوسری گھوڑی ساتھ تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم تینوں الگ الگ گھوڑے گھوڑیوں پر بیٹھے پیارا سنگھ کے دوست اجا گر سنگھ کے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ ہم ویران کھیتوں' کھنڈر نالوں' اجڑے ہوئے دیہاتوں' کھیتوں میں کٹی ہوئی لاشوں کے قریب سے گزرتے اجا گر سنگھ کے گاؤں پہنچ گئے۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ یہ بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں کے باہر چھوٹی نہر بہہ رہی تھی۔ یہاں آم کا ایک باغ تھا' اس باغ میں نانک شاہی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک پرانی حویلی تھی۔ اسی حویلی میں میں اجا گر سنگھ رہتا تھا۔ بھری بھری داڑھی مونچھوں والا گول مٹول اجا گر سنگھ حویلی کے باہر بہت بڑی چارپائی پر بیٹھا' ایک ہاتھ میں چھوٹا سا گول آئینہ تھامے دوسرے ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو مروڑ رہا تھا۔ پیارا سنگھ کو دیکھ کر وہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔

"پیارے سیاں اوئے توں کدھر؟"

اجا گر سنگھ بنیان دھوتی میں تھا۔ بنیاں اور دھوتی کے درمیان سے اس کا پیٹ باہر نکلا ہوا تھا۔ عمر پیارا سنگھ جتنی ہی تھی۔ سر پر پگڑی کی بجائے بالوں کو نیلے رومال سے باندھ رکھا تھا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر اور صاحباں کی طرف ڈالی اور پیارا سنگھ کو آنکھ مار کر بولا۔

"یہ کون ہی پیارا سیاں؟"

صوبیدار پیارا سنگھ اسے ایک طرف لے گیا۔ میں نے گھوڑی سے اترنے میں صاحباں کی مدد کی۔ ہم دونوں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ صاحباں اپنی انگلیاں دبا رہی تھی۔ اس نے چادر سے سر ڈھانپا ہوا تھا' آنکھوں میں وہی ویرانی برس رہی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے صوبیدار پیارا سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے دوست اجاگر سنگھ کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ اجاگر سنگھ نے پیارا سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہا۔ دونوں ہماری طرف آ گئے۔ پیارا سنگھ نے مجھے کہا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں' میں نے اپنے دوست کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کل یا پرسوں رات کو میں آ کر تمہیں یہاں سے امرتسر کیمپ کی طرف لے چلوں گا۔"

پیارا سنگھ یہ کہہ کر چلا گیا۔ اجاگر سنگھ نے حویلی کے عقب میں ہمیں ایک کوٹھری میں دو چارپائیاں ڈلوا دیں۔ میں مسلمان لڑکی کو اپنے سے الگ نہیں رکھنا چاہتا تھا' لیکن اس کا مجھے اختیار بالکل نہیں تھا۔ اجاگر سنگھ نے خود ہی ہمیں ایک کوٹھری دے دی۔ رات کو اجاگر سنگھ ہمارے لیے خود دال روٹی لے کر آیا۔ کوٹھری کے ساتھ ہی ایک پرانا غسل خانہ تھا' یہاں میں نے اور صاحباں نے منہ ہاتھ دھویا۔ صاحباں ابھی تک خوفزدہ تھی۔ اجاگر نے روٹی کی چنگیر چارپائی پر رکھ دی اور کہنے لگا۔

"تم لوگ دن میں بغیر ضرورت کے باہر مت نکلنا۔ یہاں کوئی آتا تو نہیں مگر پھر بھی کرپال اہنگ اپنے آدمیوں کو لے کر آ سکتا ہے۔ تم بالکل نہ گھبرانا۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔ میں نے پیارا سنگھ کو بچن دیا ہے' میں اسے نبھاؤں گا۔"

صاحباں کو میں نے زبردستی روٹی کھلائی۔ آخر زندہ بھی رہنا تھا ہمیں۔ رات ہو گئی تو دور سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہندو سکھ غنڈوں کے نعروں کی آواز سنائی دے جاتی۔ میں نے صاحباں کو بڑی مشکل سے سلا دیا اور خود جاگتا رہا۔ پھر بھی مجھے نیند آ گئی اور میں چارپائی پر وہیں پڑ گیا۔ خدا جانے رات کا کیا بجا ہو گا کہ نعروں کی آواز اور بندوق کے فائروں سے میری آنکھ کھل گئی۔ صاحباں بھی اٹھ بیٹھی۔ ڈر کے مارے اس کی گھگی بندھ رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور بند دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ یہ کوٹھری حویلی کے عقب میں تھی اور نعروں کی آوازیں حویلی کے سامنے والے صحن کی طرف سے آ رہی تھیں۔ کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"اجاگر! تو ہمارے ساتھ غداری کر رہا ہے' پیارا اس لڑکی کو تمہارے پاس رکھوا گیا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دے۔"

صاحباں پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو کر چارپائی پر گر گئی۔ باہر سے بندوق کے فائر کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا۔

میں نے لپک کر صاحباں کو دیکھا' وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

باہر جو شور مچا تھا اس میں اجاگر سنگھ کی آواز نمایاں تھی۔ وہ غنڈوں کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ بندوق کا ایک فائر ہوا اور شور آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ پھر دور سے نعرے کی آواز آئی اور خاموشی چھا گئی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کوٹھڑی کے بند دروازے سے لگا تھا۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں پیچھے ہٹ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اندھیرے میں مجھے اجاگر سنگھ کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں دو نالی بندوق تھی۔ وہ اندر آ گیا۔

''بے فکر رہو، کرپالے کے آدمی آئے تھے، میں نے انہیں بھگا دیا ہے۔۔۔۔۔۔اس کڑی کو کیا ہوا ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ خوف کے مارے بے ہوش ہو گئی ہے۔

وہ بولا۔''اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارو، گھبراؤ نہیں۔۔۔۔۔۔جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''



موت کے سائے

شاید رات دس بجے کا وقت ہو گا کہ دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ صاحباں نے اندھیرے میں دہشت زدہ آواز میں خدا کو پکارا۔ میں نے ٹاپوں کی آواز پر کان لگا دیئے۔ یہ تین چار گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز لگ رہی تھی۔ میں بھی اندر سے ڈر گیا۔ ہندو سکھ غنڈوں کا جتھہ آ گیا تھا۔ لیکن عجیب بات تھی۔ نعروں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ٹاپوں کی آواز حویلی کے سامنے والے صحن میں آ کر رک گئی۔ پھر کسی نے اجا گر سنگھ کو پکارا۔ میری جان میں جان آ گئی۔ یہ صوبیدار پیارا سنگھ کی آواز تھی۔ میں نے صاحباں سے کہا کہ پریشان نہ ہو یہ پیارا سنگھ ہے۔ حویلی کے سامنے والے صحن کی جانب سے اجا گر اور پیارا سنگھ کی باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے پیارا سنگھ نے کہا کہ میں ہوں' دروزہ کھول دو۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ پیارا سنگھ کے کاندھے سے اس کی رائفل لٹک رہی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

''میرے ساتھ نکل چلو' جلدی کرو۔''

اس نے ہمیں گھوڑوں پر بٹھایا اور رات کے اندھیرے میں ساتھ لے کر چل پڑا۔ حویلی کے پیچھے آم کے گھنے درختوں کا باغ تھا' رات کے وقت اس باغ میں اندھیرا چھایا تھا۔ اس اندھیرے پر موت کا سایہ تھا۔ باغ سے نکل کر ہم کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ایک نہر پر آ گئے۔ رات کی تاریکی میں نہر کا پانی دھندلے شیشے کی طرح لگ رہا تھا۔ نہر کی پٹڑی دور تک ویران تھی۔ ہمارے گھوڑے قدم قدم چل رہے تھے۔ پیارا سنگھ کا گھوڑا آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ ایک جگہ نہر کی ٹھوکر آ گئی۔ یہاں نہر پر چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ پیارا سنگھ نے پل پار نہ کیا بلکہ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گھوڑے کو نیچے اتار دیا۔ نیچے شاید امرود کے باغ تھے۔ ان باغوں میں ایک کچا راستہ جاتا تھا۔ ہمارے گھوڑے اس راستے پر چلے جا رہے تھے۔ باغ سے نکلے تو سامنے ریلوے لائن آ گئی۔ پیارا سنگھ ہمیں لے کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چلنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھ لیتا تھا۔ ہم اندھیرے میں گھوڑوں پر بیٹھے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ کافی دیر تک چلتے رہے۔

ہم امرتسر شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ امرتسر میرا شہر تھا لیکن اب وہ مجھ سے بہت دور ہو چکا تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے دور افق پر سرخ روشنی دکھائی دی۔ یہ امرتسر شہر کے مکان جل رہے تھے۔ جونہی ہم نے ایک چھوٹی سی نہر کے پل کو عبور کیا میں نے علاقے

کو پہچان لیا۔ یہ امرتسر شہر کے مشرق کی طرف مقبول پورے کا علاقہ تھا۔ دور مقبول پورے کی بستی پر موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے وہاں کوئی مسلمان نہیں بچا ہوگا۔ شاید ہی کوئی خوش قسمت جان بچا کر شریف پورہ پہنچا ہو۔ تھوڑی دور تک ریل کی پٹڑی پر چلتے رہنے کے بعد جنوب کی طرف سے کلکتہ جانے والی مین لائن بٹالہ والی ریلوے لائن کے ساتھ آ کر مل گئی۔ پیارا سنگھ نے بتایا کہ امرتسر کے سارے مسلمان شہر خالی کر کے شریف پورے والے کیمپ میں آ گئے ہوئے ہیں۔

شریف پورہ کیمپ

ہماری دوسری جانب ریلوے لائن کے پار اور شریف پورے کے سامنے امرودوں کے باغ شروع ہوئے تو پیارا سنگھ نے گھوڑے کو روک لیا' کہنے لگا۔

''ملک صاحب! میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے' یہ سامنے شریف پورہ ہے۔ اب میں واپس جاتا ہوں۔ واہگورو کرے کہ تم اپنے پاکستان پہنچ جاؤ۔''

میں پیارا سنگھ کا شکریہ ادا کرنے لگا تو وہ بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔ کیپٹن صاحب کو میرا اسلام کہنا۔ میری طرف سے معافی ضرور مانگنا' میں ان کے کسی کام نہیں آ سکا۔ اللہ بیلی!''

یہ کہہ کر صوبیدار پیارا سنگھ نے خالی گھوڑوں کی باگیں تھامیں اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چالی کھوہ والے کھیتوں کی طرف اندھیرے میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سامنے حسین پورہ' شریف پورہ کیمپ تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ رفیوجی کیمپ نہیں تھا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اور جیسا کہ امرتسر کے رہنے والوں کو علم ہوگا کہ اس مسلم آبادی کو بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے اپنی حفاظت میں لے کر کیمپ قرار دے دیا تھا اور امرتسر شہر سے نکل کر تقریباً سبھی بچے کھچے مسلمان یہاں آ کر پناہ گزین ہو گئے تھے اور لاہور سے آنے والے مسلم لیگ کے ٹرکوں کا انتظار کر رہے تھے۔

میں شریف پورہ کیمپ تو نہ پہنچ سکا۔ موت قدم قدم پر میرا تعاقب کر رہی تھی۔ ہو سکتا ہے صاحباں شریف پورہ کیمپ میں پہنچ چکی ہو۔ میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ڈالتا امرتسر سے جالندھر اور پھر ایک عیسائی محسن پیٹرک کی مدد سے ہندو سکھوں کے ایک قافلے میں شامل ہو کر دلی چلا گیا۔ وہاں سے کلکتہ اپنے چچا کے ہاں تقریباً ایک مہینے تک رہا۔ اس کے بعد کئی دنوں کے کٹھن اور تکلیف دہ سفر کے بعد مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کی سرزمین پر

ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں میں نے پانچ روپے پر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور لاہور جانے کے لیے تگ ودو شروع کر دی۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا۔ ڈھاکہ سے کراچی کے لیے پی آئی اے کی سروسز ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پی آئی اے کا ابھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس کا نام شاید اورینٹل ایئر لائنز تھا۔ اس کا پہلا فوکر جہاز ایک دن پہلے کراچی کی طرف گیا تھا۔ اب کوئی پتہ نہیں کہ وہ کب وہاں سے آئے گا اور پھر ڈھاکہ سے کب کراچی جائے گا۔ لیکن میں مطمئن تھا کہ کم از کم دشمن کے علاقے سے نکل کر اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ میری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ڈھاکہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہ پاکستان تھا۔ میں کہیں نہ کہیں کوئی کام ڈھونڈ لوں گا اور پھر ہوائی جہاز کا کرایہ جمع کر کے کراچی چلا جاؤں گا۔ میں نے ڈھاکہ میں کام کی تلاش شروع کر دی۔ ڈھاکہ سے بہت کم ہندو نقل وطن کر کے بھارت گئے تھے چنانچہ کام تلاش کرنے میں مجھے دو ایک روز دربدری کرنی پڑی۔ کملا پوری کے علاقہ میں ایک نوادرات کی دکان نظر آئی جس پر کشمیر ایمپوریم کا بورڈ لگا تھا۔ میں دکان میں داخل ہو گیا۔ ایک خوش شکل کشمیری نوجوان کاؤنٹر پر بیٹھا ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے سلام کر کے پنجابی میں کہا کہ مجھے کام چاہیے۔ میں ایف اے پاس ہوں۔ کشمیری نوجوان نے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"سوری! یہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

جب میں نے اس کشمیری نوجوان کو بتایا کہ میں بھی کشمیری ہوں اور کن حالات میں ہندوستان سے نکل کر وہاں تک پہنچا ہوں اور اب واپس لاہور جانے کے لیے جہاز کا کرایہ جمع کرنے کی لیے نوکری کرنا چاہتا ہوں تو اس کا لہجہ اور رویہ بدل گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی، میرے لیے چائے منگوائی اور کہا۔

"یہاں کے حالات ایسے ہیں کہ پاکستان بن جانے کے بعد بہت سے غیر مسلم کاروباری روپیہ ساتھ لے کر کلکتے بھاگ گئے ہیں۔ ہماری بے شمار ادائیگیاں رکی پڑی ہیں۔ بہر حال تمہیں میں اپنے ایمپوریم پر ملازم رکھ لیتا ہوں۔ میں فی الحال پچاس روپے سے زیادہ تنخواہ نہیں دے سکتا اور رہائش کا انتظام بھی تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔"

میں نے اس کی ساری شرطیں مان لیں اور کام شروع کر دیا۔

میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ میں تو رات جیل میں بھی کاٹ سکتا تھا۔ اب میں نے لاہور پہنچنے کے لیے تگ ودو شروع کر دی۔

ہوائی جہاز کا کرایہ بہت تھا۔ ہوائی جہاز کے ذریعے میں پاکستان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بحری جہاز کا کرایہ زیادہ نہیں تھا۔ میں نے بحری جہاز کے کرائے کے لیے پیسے جمع کرنا شروع کر دیے۔

ایک مہینہ گزر جانے کے بعد جب دکان کے مالک کو مجھ پر اعتماد ہو گیا اور میرے شریفانہ رویے نے اسے متاثر بھی کیا تو اس نے ایک روز کہا۔

''تم اوپر چھت والی کوٹھڑی میں سو جایا کرو۔''

اتوار کو چھٹی ہوتی تھی اور اتوار کا دن میرا بڑا بور گزرتا تھا۔ باقی دنوں میں تو نوادرات کی دکان پر بڑی رونق رہتی تھی۔ غیر ملکی اور ملکی مرد خواتین گاہک آتے رہتے اور جی لگا رہتا تھا اور دن گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

پاربتی

ایک روز میں چھت پر کھڑا نیچے سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ جب میں واپس اپنی کوٹھڑی کی طرف بڑھا تو میری نظر سامنے والے مکان کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں ایک سانولے رنگ کی لڑکی اپنے مکان کی منڈیر پر کہنی ٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیر سے مجھے بازار میں جھانکتے دیکھ رہی ہے۔ نگاہیں چار ہوئیں تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی بجائے وہیں اسی طرح کھڑی رہی بلکہ مسکرا دی۔ میں بھی مسکرا دیا۔

میں اپنی چھت کی گلی والی منڈیر کے پاس آ گیا۔ اب میرے اور لڑکی کے درمیان وہی تنگ گلی کی گہری کھڈ تھی۔ لیکن یہ فاصلہ اتنا تھا کہ ہم بازو پھیلا کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ سکتے تھے۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر میں عشق کرنے پر پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔

لڑکی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ''تم کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے بنگلہ میں جواب دیا۔ ''کلکتہ سے آیا ہوں' اب لاہور جاؤں گا۔''

وہ کسی قدر تعجب کے ساتھ بولی۔ ''مگر تم شکل سے بنگالی نہیں لگتے' پھر بنگلہ کیسے بول لیتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں نے کلکتے میں بنگلہ سیکھی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ مسکرا رہی تھی' کہنے لگی۔ ''میرا نام پاربتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا کیا نام ہے؟''

یہ ہندو بنگالی لڑکی تھی۔ میں نے فوراً کہا۔ ''میرا نام کیلاش چندر ہے۔''

میرے اس انکشاف پر کہ میں ہندو ہوں' وہ بڑی خوش ہوئی' کہنے لگی۔

''تم ہندو ہو تو یہ دکان تو سنا ہے مسلمانوں کی ہے۔تم یہاں نوکری کیوں کرتے ہو؟''

میں نے کہا۔''میں کراچی جانے کے لیے کرایہ جمع کر رہا ہوں''

جھوٹ بولنے والا کا حافظہ خراب ہو جاتا ہے۔میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔میں بھول ہی گیا تھا کہ میں ہندو ہوں اور پاکستان جا رہا ہوں جو مجھے اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔اب اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہندو ہو تو پاکستان کیوں جا رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔وہ تو مسلمانوں کا ملک بن گیا ہے۔''

میں نے فوراً ایک اور جھوٹ بولا۔

''دراصل کراچی میں ہمارے کچھ رشتہ دار پھنس گئے ہیں' انہیں وہاں سے ہندوستان لانے جا رہا ہوں۔''

وہ مطمئن ہو گئی۔اتنے میں نیچے گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔اس نے منڈیر پر سے سر جھکا کر نیچے دیکھا۔جلدی سے پیچھے ہٹی اور بولی۔

''میرے جیجاجی آ رہے ہیں' میں جاتی ہوں۔''

وہ چھت کی سیڑھیوں کی طرف دوڑی' پھر اچانک رکی' منڈیر کے پاس آئی اور شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''تم کوٹھڑی میں سوتے ہو ناں' مجھے معلوم ہے۔''

اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہوئی چھت کی سیڑھیاں اتر گئی۔میں کچھ دیر وہاں رکا خالی چھت کو دیکھتا رہا۔مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ جتنی دیر اب وہاں رہوں گا بور نہیں ہوں گا۔

آدھی رات گزر چکی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔کسی نے کوٹھڑی کا ادھ کھلا دروازہ بند کیا تھا۔میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

''کون ہے؟'' میں نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا تو ایک نسوانی آواز نے بنگلہ میں کہا۔

''شور کیوں مچاتے ہو؟۔۔۔۔۔۔۔میں ہوں پاربتی''

مجھے حنا کے عطر کی خوشبو آئی۔وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔

''میں چٹاگانگ میں رہتی ہوں۔یہاں اپنی بہن سے ملنے آئی ہوں۔چٹاگانگ میں ہماری اپنی باڑی ہے ہم وہاں کھیتی کرتے ہیں۔ہمارا ایک چھوٹا سا باغ ہے۔وہاں موسمبیوں کے پیڑ ہیں۔تم ہماری باڑی پر آؤ گے تو میں تمہیں اپنے باغ کی موسمبیاں کھلاؤں گی۔''

میں نے پوچھا۔

''تم چھت پر سے کود کر آئی ہو کیا؟''

اندھیرے میں مجھے اس کی ہنسی کی آواز آئی۔

''ویسے میں چھت پر سے کود بھی سکتی ہوں' مگر میں نے دونو منڈیروں پر بانس کی کھاٹ ڈال دی ہے۔ بس اس پر لیٹ کر رینگتی ہوئی تمہاری چھت پر آ گئی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے گھر میں کوئی جاگ پڑا تو کیا ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''جیجا جی دارو پی کر بے ہوش ہو کر سو رہے ہیں' تم کیوں فکر کرتے ہو۔ تمہیں تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اس طرح تیری بدنامی ہوگی پاربتی''

اس نے میری بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے رشتہ داروں کو پاکستان سے لا کر کلکتے چلے جاؤ گے کیا؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں' میرے رشتے دار کلکتے کے رہنے والے ہیں۔ وہ کراچی میں اپنے ملنے والوں کے پاس گئے ہوئے تھے کہ پاکستان بن گیا۔ ویسے میں انہیں کلکتے چھوڑ کر امرتسر چلا جاؤں گا۔''

پاربتی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی۔

''تم چنا گانگ آ جاؤ' وہاں ہم روز ملا کریں گے۔ تم رات کو ہمارے باغ میں آ جایا کرنا' وہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا' میں کوشش کروں گا۔''

''کوشش نہیں کیلاش!'' اس نے میرے ہاتھوں کو چوم کر کہا۔ ''وعدہ کرو تم چنا گانگ مجھ سے ملنے آؤ گے۔''

مجھے فلم دیوداس کا وہ منظر یاد آ گیا جب دیوداس پاربتی سے آخری بار جدا ہوتے ہوئے کہتا ہے۔

''پاربتی! میں مرنے سے پہلے تمہیں ملنے ہردوان ضرور آؤں گا۔''

یہ لڑکی عاشقانہ جذبات میں شرابور تھی' مگر اس کا جذبہ بڑا معصوم اور بے داغ تھا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ بادلوں میں دھیمی سی گرج بیدار ہوئی اور چھت پر بارش کی بوندیں گرنے کی آواز آنے لگی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور بولی۔

''اب جاتی ہوں' پانی برسنے لگا ہے۔ کل رات کو آؤں گی۔''

وہ دروازہ کھول کر چھت پر دبے پاؤں منڈیر کی طرف بھاگ گئی۔ میں بھی کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ اس نے دونوں چھتوں کی منڈیروں پر گلی کی خندق کے اوپر بانس کی چارپائی الٹی ڈال دی اور اندھیرے میں سیڑھیوں کی طرف غائب ہو گئی۔ میں بارش کی بوندا باندی میں اندھیری چھت پر یوں کھڑا تھا جیسے مجھے کوئی آسمانی پری جادو کی چھڑی سے چھو کر گزر گئی ہو۔ بادل زور سے گرجا۔ میں جلدی سے اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا اور چادر لے کر سوچنے لگا' میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا۔ لیکن نہیں' یہ خواب نہیں تھا۔ کوٹھڑی کی فضا میں ابھی تک پاربتی کے گرم سانسوں اور حنا کے عطر کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرے دن میں نوادرات کی دکان میں گاہکوں کے ساتھ معمول سے زیادہ خندہ پیشانی سے پیش آ رہا تھا۔ میرے جسم میں جیسے کسی نے روشنی بھر دی تھی اور روشنی کے پیانا میرے انگ انگ سے پھوٹ رہے تھے۔ دوپہر کے بعد میں دوبارہ اوپر چھت پر گیا مگر پاربتی کے مکان کی چھت خالی تھی۔ رات نو بجے جب دکان بند ہو گئی تو میں ہوٹل میں کھانا کھانے کی بجائے چھت پر آ گیا۔ پاربتی اس وقت بھی چھت پر نہیں تھی۔ آدھی رات تک تو مجھے نیند ہی نہ آئی۔ پاربتی کے آنے کی طرف دھیان لگا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں آدھی رات کو آؤں گی۔

رات کے دو بج گئے۔ میں کئی بار اٹھ کر چھت پر گیا مگر پاربتی کے مکان پر سناٹا طاری تھا۔ آخر میں یہ سوچ کر سو گیا کہ ہو سکتا ہے پاربتی کو موقع نہ مل سکا ہو۔ دوسرے دن دکان میں میرا موڈ آف تھا اور میں غیر ملکی سیاحوں کو بادل نخواستہ نوادرات دکھاتا رہا۔ کھانے کے وقفے سے کچھ پہلے اچانک میں نے پاربتی کو ایمپوریم میں داخل ہوتے دیکھا۔

پاربتی نے عنابی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور جوڑے میں موتئے کی کلیوں کا گجرا سجایا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور اس نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا۔ دکان کا مالک کاؤنٹر پر بیٹھا حساب کتاب میں لگا تھا۔ پاربتی شیشے کے شوکیس اور الماریوں میں سجے ہوئے نوادرات کو دیکھنے لگی۔ میں نے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

"رات کو کیا ہو گیا تھا؟"

وہ زیر لب شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ پیتل کی ایک صراحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"بہن جی بیمار تھی' آج آؤں گی۔"

میں الماری میں سے پیتل کی صراحی نکال کر اسے دکھانے لگا۔

"یہ خالص ایرانی صراحی ہے میڈم' اس کی میناکاری تو لاجواب ہے۔"

پاربتی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کاؤنٹر کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ دکان کے مالک نے ایک بار آنکھیں اٹھا کر پاربتی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ جب پاربتی چلی گئی تو خواجہ کہنے لگا۔

"یہ تو ہریا کی سالی ہے' یہ دکان پر کیسے آ گئی۔۔۔۔۔۔اس کو کیا پتہ نوادرات کیا ہوتے ہیں۔"

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

اب رات کا انتظار شروع ہو گیا۔ بہر حال رات آئی۔ اندھیرا چھا گیا۔ گلی کی خندق کے اوپر بانس کی چارپائی ڈال دی گئی اور پاربتی اس پر سے رینگ کر میری کوٹھری میں آ گئی۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ اگلی رات آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

وطن کی نئی روشنی

وقت گزرتا گیا۔ میں نے اتنی رقم جمع کر لی کہ چٹا گانگ سے سمندری جہاز میں کراچی تک سفر کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں نے اپنے کپڑے ٹرنک میں رکھے اور "کشمیر ایمپوریم" کے مالک کا شکریہ ادا کر کے اس سے رخصت ہو کر ڈھاکہ کے کملاپور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ پاربتی کا تھوڑی دیر خیال آیا۔ پھر میں اسے بھول گیا۔

کملاپور اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہو کر چٹا گانگ پہنچا اور جہاز کا ٹکٹ خرید کر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا۔ جہاز کو تین روز بعد روانہ ہونا تھا۔ میں بہت خوش تھا۔ میرے طویل اور مصائب سے پر سفر کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ اب میں بہت جلد اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملنے والا تھا۔ چٹا گانگ میں میرے لیے تین دن ٹھہرنا محال ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا کہ میں چٹا گانگ کی بندرگاہ سے کراچی جانے والے سمندری جہاز کے ڈیک پر کھڑا اس شہر کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ سمندری سفر کافی طویل تھا۔ موسم برسات کا نہیں تھا اس لیے جہاز کی رولنگ نارمل تھی۔

ایک طویل سمندری سفر کے بعد جہاز جب کراچی کی بندرگاہ کے ساتھ لگا تو میرا دل چاہا کہ اتر کر پاکستان کی زمین کو چوم لوں۔ میں ہی جانتا تھا کہ اس سرزمین پر پہنچنے کے لیے مجھے کیسی کیسی مصیبتیں نہیں جھیلنی پڑیں۔ مجھے اپنے پیارے وطن کی قدر تھی۔ اس سرزمین نے ایک مشفق ماں کی طرح مجھے اپنی گود میں پناہ دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں پاکستان میں' اپنے گھر میں' اپنے گھر کے آنگن میں آ گیا ہوں۔ سب لوگ مجھے اپنے بہن بھائی لگ رہے تھے۔ ہر گھر مجھے اپنا گھر لگتا تھا۔ اسی روز میں کراچی سے ٹرین پکڑ کر لاہور کی طرف چل دیا۔

لاہور کے کھیتوں' مکانوں' درختوں اور سڑکوں کو دیکھتے ہی میرے جسم میں زندگی اور جذبات کا تازہ خون دوڑنے لگا۔ لاہور شروع

ہی سے میری امیدوں' آرزوؤں کا مرکز رہا تھا اور آج بھی ہے۔ مکانوں پر پاکستان کے سبز پرچم لہراتے دیکھ کر میرا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا۔ میں اپنے وطن میں تھا۔ آزاد وطن پاکستان میں آ گیا تھا۔ میری تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ بہت جلد میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے آن ملا۔ یہ سب لوگ جانیں بچا کر امرتسر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک جدوجہد ختم ہو گئی تھی' دوسری جدوجہد کا آغاز ہو رہا تھا۔ پرانا سورج غروب ہو چکا تھا۔ نیا چمکیلا روشن اور زندگی سے بھرپور سورج طلوع ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے پرانے زخموں کو بھلا دیا۔ پرانے دکھوں کو جھٹک کر اپنے دل سے نکال دیا اور اپنے نئے وطن کی نئی روشنی کی راہنمائی میں نئی زندگی کی شاہراہ پر چل پڑا۔

